ایک پاکیزہ معاشرتی ناول

سچے بندھن

عفت موہانی

قیمت

چھ روپیہ

ناشر

نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

ٹیلیفون { آفس :- ۲۴۵۵۹
رہائش :- ۲۵۳۳۴

پرنٹر :- نظامی پریس لکھنؤ

ناشر :- عزیز الرحمٰن

دھوپ کی تمازت بڑھنے لگی تھی۔ ہواؤں کے گرم بگولے سنسان سڑکوں
پر وحشیانہ انداز میں چکرا رہے تھے۔ اکا دکا راہگیر سڑک پر چلتے نظر آتے
دور و نزدیک سناٹے کی حکمرانی تھی!۔ موسم خشک اور ناگوار تھا

ساجد نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ ایک آوارہ نظر اس نے کار سے باہر
ڈالی۔ سڑک اس کے قدموں کے نیچے سے پھسل رہی تھی۔ مکانات پیچھے بھاگ
رہے تھے۔ درخت، بجلی کے کھمبے، مسافر اور دکانیں سب تیزی سے بھاگے
جا رہے تھے۔ گرم اور تند بگولے اس کے دماغ میں بھی گھوم رہے تھے
ہوش و حواس سے عاری وہ بس گاڑی بھگائے جا رہا تھا!۔

آبادی پیچھے رہ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا!۔ اس کے اس ہنگامی فرار نے
کوٹھی میں کھلبلی مچا دی ہو گی!۔ تین چار دن گزر چکے تھے وہ کوٹھی میں
نظر بند تھا!۔ اس کے سخت گیر باپ نے حکم جاری کر دیا تھا کہ وہ گھر سے
باہر نہ نکلے۔ گیرج مقفل کر دیئے گئے تھے اور چوکیدار کو تاکید کر دی گئی تھی کہ
پھاٹک اس کے حکم سے ہرگز نہ کھولا جائے۔

ماں کسی قدر نرم دل تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ جوان اور صاحب
اختیار لڑکے پر اس قسم کی پابندی عائد کر کے اسے بڑوں سے باغی بنایا جائے
لیکن ان کی سرکار، افتخار الدولہ بہادر نے کب سُنی تھی۔ وہ تو بے ملک سے

نواب بے تاج کے بادشاہ بنے پھرتے تھے۔ مفلسی اور غربت کی ایک طویل زندگی گزارنے کے بعد دوسری بیوی کے ذریعہ بے تحاشا دولت ہاتھ لگی تھی ساتھ ہی ان کی تقدیر نے بھی کروٹ بدل لی تھی۔ اب تو یہ حال تھا کہ مٹی کو چھوتے تو سونا بنا تے!۔ مل اونر تھے۔ کئی کوٹھیوں اور باغات کے مالک۔ سیدھے منھ کسی سے بولتے نہیں تھے۔۔ بیوی نے بھی پشتینی دولت کے درمیان آنکھ کھولی تھی مگر وہ ایسی شتر بے مہار اور فرعون بے سامان نہیں تھیں!۔ مبارز نے بھی اپنی زندگی کے دس بارہ سال مفلسی کا مزہ چکھا تھا! ویسے اسے اپنے والد محترم کی دوسری شادی کبھی یاد نہ تھی۔ اور یہ بھی احساس نہ تھا کہ نئی امّی نے باپ کو غربت کے بھیانک تحت الثریٰ سے اٹھا کر امارت کے جگمگاتے عرش پر بٹھا دیا تھا۔ وہ اس گھمنڈ کو قطعی پسند نہیں کرتا تھا! اسے افلاس اور غربت ہی سے پیار تھا! اپنا شاندار طرز رہائش عالیشان کوٹھی۔ دولت کے انبار سے اپنی ذات پر تمسخر کرتے ہوئے لگتے تھے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ باپ کا حکم تھا کہ اپنا انداز شاہانہ رکھا جائے۔

اسے اپنی پھوپھی زاد بہن سے محبت تھی۔ وہ بھی غریب تھی۔ اس کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ سردار صاحب نے اپنی حقیقی چھوٹی بہن سے سارے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ وہ بے چاری ایک دور افتادہ قصبہ میں رہتی تھیں شوہر کسی فیکٹری میں ملازم تھے۔ آمدنی اتنی ہی تھی کہ کسی کے دست نگر نہیں تھے۔ سفید پوشی برقرار تھی۔ بڑا لڑکا آرٹس کالج میں پارٹ ٹائمر تھا اور ساتھ ہی نائٹ کالج میں پڑھ بھی رہا تھا۔ نکہت کی شادی ہو چکی تھی۔ رخشندہ شروع ہی سے مبارز سے منسوب تھی۔ سردار صاحب بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔ لیکن جب تمول نے ان کے دروازے پر دستک دی تب ان کی آنکھیں غریبی کی نیند سے کھل گئیں انہیں احساس ہوا کہ اب

تک وہ کس پستی میں پڑے گھٹی گھٹی سانسیں لے رہے تھے۔ پھر انھوں نے اپنی حقیقی بھتیجی کو نظروں سے گرا دیا۔ اس کی تمام خوبیاں خرابیوں سے بدل گئیں۔ اس کے محاسن عیب بن گئے۔ اب وہ اسے اپنی اکلوتی بہو بنانے کے اروادارہ کیا ہوتے کہ انھیں اپنی بہن کی بچی کہنا بھی گوارا نہ تھا!

لیکن مبارز کو اسی سے محبت تھی!۔ سردار صاحب نے اپنے ہم پلہ ایک سرمایہ دار کی صاحبزادی سے زبردستی مبارز کی منگنی کر دی تھی اور مبارز کے سر سے رخشندہ کا سودا نکالنے کی خاطر اعلان کر دیا تھا کہ جلد تر اسے شادی کی آہنی زنجیروں میں بھی جکڑ دیا جائے گا!۔ باپ بیٹے میں کچھ حجت بھی ہو چکی تھی!۔ ہار مبارز کی تقدیر میں لکھی تھی!۔ سردار صاحب نے حکم دیے دیا کہ وہ کوٹھی سے باہر قدم بھی نہیں نکال سکتا!۔

لیکن کب محبت کے سودائیوں نے طوق و سلاسل کی گرانباری کی پرواہ کی ہے۔؟ چھ دن بمشکل تمام اس نے نظربندی کی حالت میں گزارے اور جس دن موقعہ ملا۔ چوکیدار کی موجودگی ہی میں پھاٹک کا قفل توڑ کر گاڑی لے بھاگا!۔

سردار صاحب کی بیوی کو سب کچھ معلوم تھا مگر وہ خاموش ہی رہیں۔ ان کی دانست میں سردار صاحب ہی غلطی پر تھے!۔ ذرا سی دیر میں چوکیدار ہانپتا کانپتا ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"سرکار تو مجھے گولی مار دیں گے۔ حضور" ہیبت کے مارے وہ کانپ رہا تھا!۔ انھیں ہنسی آ گئی "مطمئن رہو۔ اگر وہ تمھیں نوکری سے ہٹا بھی دیں تو تمھاری تنخواہ میں برابر دیتی رہوں گی۔ میں دیکھ رہی تھی۔ گل خان۔ تم اگر راستے سے ہٹ نہ جاتے تو مبارز تم پر گاڑی چڑھا دیتے!"

"جی ہاں سرکار۔!"

"میں سب ٹھیک کرلوں گی۔تم جاؤ۔!"

وہ سردار صاحب سے گفتگو کرنے کا پیرایہ ڈھونڈتی رہیں!۔

مبارز جس وقت پھوپھی کے گھر پہنچا۔ سورج عین سر پر چمک رہا تھا!۔ اس نے سن ہیٹ ابروؤں تک جھکا دی۔ آستینیں بانہوں پر الٹ دیں اور اسٹیرنگ وھیل پر سر رکھ کر سانس درست کرنے لگا... یا خدا۔ میں یہاں کس لئے آیا ہوں... اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیئے۔؟

پھر اس نے ٹوپی پچھلی سیٹ پر پھینکی۔ بال برابر کئے اور مردہ قدموں سے دروازے تک چل کر آہستہ سے دستک دی!۔

دو لمحوں بعد کسی نے دروازہ کھولا۔

"آپ؟" رخشندہ کے ہاتھ سے پردہ گر گیا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا "رخشی!۔کیا تمہیں میرا انتظار نہیں تھا؟"

"کس کا جذب دل آپ کو یہاں تک کھینچ لایا ہے؟" رخشندہ نے مدھم آواز میں کہا پھر جلدی سے بولی "آیئے۔ اندر چلئے۔ رات کو چچی جان کے انتقال کی خبر سن کر ابا امی چلے گئے تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ بھیا اندر سو رہے ہیں کیا آپ ان سے نہیں ملیئے گا؟"

مبارز اندر آیا اور پژمردہ سا تخت کے کونے پر ٹک کر سر دیوار سے ٹیک دیا۔ رخشی پریشان اور فکرمند سی اسے دیکھتی رہی۔ مبارز کے جسم پر پُرشکن لباس تھا۔ چہرے پر شیو بڑھ رہا تھا!۔ کلائی کی گھڑی میں چھ بج رہے تھے۔ جب کہ ایک بجے کا آفتاب آگ برسا رہا تھا!۔

بھیا کو جگا دوں؟" وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ نہ کہہ سکی تو
بہت سوچ کر یہی کہا۔
"نہیں رخشی! ۔ میں بھیا سے ملنے نہیں آیا۔ انھیں آرام سے سونے دو
اگر وہ میرے یہاں سے جانے کے بعد بھی نہ جاگیں تو انھیں میری آمد کی اطلاع
بھی نہ دینا... میں تو ....!"
"کیا بات ہے ۔ مجھ سے کہیے نا" وہ بے چین ہونے لگی "اتنے پریشان
تو آپ کبھی نہیں ہوتے تھے ... میں آپ کے لئے کوئی ٹھنڈی چیز پینے کے لئے؟"
"نہیں رخشی! ۔ کچھ بھی نہیں۔ جو آگ میرے جسم میں بھڑک رہی ہے وہ
برف کی سلیں رکھ دینے میں ٹھنڈی نہیں ہوگی" اس نے کہا۔ اور پھر رخشندہ
کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ اسے معلوم تھا۔ مبارز سے اس کا کیا رشتہ تھا
یکبارگی اس کی پلکیں جھک گئیں۔ حیا کے اس انداز میں جو اپنائیت اور سپردگی
تھی ۔ اس نے مبارز کے جذبات میں ہلچل مچا دی ۔
"رخشی؟"
"جی ۔!"
"ایک بات پوچھوں تم سے!"
وہ مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی ۔
"تمھیں آج تک میں نے کوئی دھوکا تو نہیں دیا؟"
"ائے اللہ ۔ کیا میں نے کبھی کوئی شکایت کی ہے آپ سے؟"
"تمھیں میری محبت اور وفا پر یقین ہوگا۔ رخشی؟"
"پتہ نہیں ۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ ۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں
آرہا ہے"

"تمہیں پتہ ہے رخشی! امارت و غربت کے بہت سے اعتبارات کو میں بالکل ڈھونگ دنیاداری اور چھچھوراپن سمجھتا ہوں؟"

"جی ہاں۔ امی تو کہتی ہیں کہ آپ فرشتہ ہیں۔ دولت کے انبار نے آپ کو ہم سب سے اوجھل نہیں کیا۔ آپ چاندی کی دیواریں پھلانگ کر ہمارے پاس آتے ہیں!"

"اگر یہ دیواریں اور بلند ہو جائیں۔ ہمارے تمہارے درمیان آجائیں نہ تم مجھ تک پہونچ سکو نہ میں تمہارے پاس آسکوں۔ تو پھر کیا ہوگا رخشندہ؟"

"ماموں جان نے کچھ کہا ہے آپ سے؟" اس کے رخساروں کا رنگ اڑنے لگا۔

"وہ زبان سے نہیں کہتے۔ ہاتھوں سے کہتے ہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرتے ہیں۔" مبارز نے ہزار چاہا کہ اس سے اپنی باپ کی سخت گیری کی کہانی نہ کہے مگر وہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ دوسرا کون تھا؟ ماں سوتیلی تھیں۔ انھوں نے اسے سگی ماں کی محبت دی تھی لیکن وہ شوہر کے آگے بے بس تھیں۔ پھوپھی بھائی سے پناہ مانگتی تھیں۔ نکہت اور اس کے شوہر نے کبھی مبارز کے معاملے میں دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ وہ تو اس سے خفا ہی رہتے تھے۔ رخشندہ کا بھائی حاکم سردار صاحب کا علانیہ دشمن تھا۔ اسے مبارز سے محبت تھی۔ دونوں ہم عمر تھے ہم خیال تھے لیکن اپنی بہن کی تقدیر کے سلسلے میں حاکم نے مبارز کا ساتھ نہیں دیا۔

اگر مل جل کر ہنسنے اور رونے والے تھے تو صرف مبارز اور رخشندہ! اور بے چاری ماں! — صحن میں تیز چمکیلی دھوپ لہریں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ چھت سے غیر مرئی آگ برس رہی تھی۔ مگر ان دونوں کو

موسم کی تہر سامانی کا بھی احساس نہ تھا۔

مبارز کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور رخشندہ تو رو ہی رہی تھی!۔

"میں سب کی سختیوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ رخشی!۔ مجھے والد محترم کی دولت کی بالکل پرواہ نہیں۔ امی میرے ساتھ ہیں!۔ وہ تمہیں بے حد چاہتی ہیں۔ ان کی مرضی بھی یہی ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے ان کے پاس آجاؤ۔ ضرورت صرف تمہارے ہمت کرنے کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پھوپھی جان اور حاکم مخالفت کریں۔ تم انھیں راضی کر سکتی ہو۔ رخشی!۔ صاف صاف کہہ سکتی ہو کہ تمھیں اپنی قسمت پر محرومی کی مہر لگانا پسند نہیں ہے۔ اگر تم پھوپھی جان سے کہہ دو تو وہ نرم پڑ سکتی ہیں۔ میں پھوپھا جان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ حاکم کو منانا میرا کام ہے۔ خدا کے لئے اپنے میں تھوڑی سی جرأت پیدا کرو۔۔۔ ورنہ بہت بھیانک جدائی ہم میں ہو جائے گی۔ رخشی!۔ اس احساس نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اگر تم مجھے نہ مل سکیں تو پھر کیا ہوگا۔ میں کیسے زندہ رہوں گا۔ بچپن کی معصوم ساعتوں سے لے کر شباب کی رنگین گھڑیوں تک میں نے تمہارے سوائے کسی اور کو اپنی زندگی سے قریب نہیں محسوس کیا۔ یہ جھوٹ نہیں ہے رخشی!۔ تم میری سانسوں میں رچی بسی ہو۔ تمہاری محبت خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی ہے۔ میں یہ سوچ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ اگر تم میری تقدیر کی ساتھی نہیں بنو گی تو پھر میرا کیا حشر ہوگا؟"

"آپ نے ماموں جان سے کیوں نہیں کہا یہ سب کچھ؟" رخشندہ کی حالت ابتر تھی۔

"ماموں جان اگر پتھر کے نہ بنے ہوتے۔ ان کے سینے میں دل کی جگہ چٹان

زندگی ہوتی۔ تو وہ سب کچھ سنتے اور محسوس کرتے۔ اگر ان کے کان ہوتے۔ آنکھیں ہوتیں تو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ تم ان کی بھتیجی ہو۔ میں ان کی امیدوں کا واحد سہارا ہوں۔ لیکن ہماری آرزوؤں سے زیادہ محبوب انھیں روپیہ ہے۔ ہماری زندگیوں سے زیادہ عزیز وہ سرمایہ ہے جو وہ روز بروز بلند سے بلند تر کرتے جا رہے ہیں... رخشندہ۔ اپنے ماموں جان کو اپنی محبت کے راستوں سے ہٹا دو۔ یہ سوچو کہ میرے بغیر تم اور تمھارے بغیر میں۔ ایک دوسرے سے بڑی دور دور کیسے اور کیونکر جی سکیں گے؟"

"میں نہیں جی سکتی" وہ آنسو بہاتی اس کے ہاتھوں پر جھک گئی "آپ کسی طرح امی سے مجھے لے لیجئے"

"رخشی!" اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور رخشندہ کے بالوں میں اپنی انگلیاں الجھا دیں "یہ اور سوچ لو کہ میری زندگی میں آنے کے بعد وہ عیش و آسائش میسّر نہ آسکے جو فی الحال مجھے ملا ہے۔ ابا جان مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ عاق کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ اپنے سارے ترکے سے مجھے محروم کر دیں۔ میں اس کا عادی ہوں رخشی! میں بخوشی ان کے گھر سے چلا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ زیست کی سنگلاخ راہوں پر تمھیں میرے ساتھ چلنا پڑے۔ صعوبتیں اور دشواریاں ہمیں پریشان کریں۔ تب نہ کہنا رخشی کے مبادا تم مجھے کہاں لے آئے؟"

رخشندہ نے نفی میں سر ہلایا۔ اور ہتھیلیوں میں آنسو سمیٹتی ہوئی بولی "آپ نے ان وفا شعار عورتوں کی داستانیں نہیں پڑھیں جو شوہروں کے ساتھ ستی ہو جاتی تھیں۔ خدا آپ کو قیامت تک سلامت رکھے۔ یہاں تو مجھے آپ کے ساتھ جینا ہے۔ مرنا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

مبارز نے جھک کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔
حاکم ان دونوں کی آوازیں سن کر دیر ہوئی جاگ پڑا تھا۔ اور اپنے کمرے میں کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا! لیکن مبارز اور رخشندہ تو اس کی موجودگی فراموش کر چکے تھے وہ بھی خاموش ہی رہا! اگرا سے اپنی بہن کی زندگی سے پیار تھا تو مبارز کی آرزو سے بھی محبت تھی لیکن وہ سردار صاحب کے وجود کا تسلط برداشت کرنے کو تیار نہ تھا! وہ سوچنے لگا کہ وہ ان دونوں کے لئے کیا کر سکتا ہے؟!
مبارز نے اپنے دل کا لاوا نکال پھینکا تو مطمئن ہو گیا۔ رخشندہ نے بھی پیماں باندھ لیا تھا۔ وہ بھی فکر مند نہیں تھی! بڑے پیار سے مبارز نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بادل نخواستہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔
امی مضطرب ہوں گی۔ میں پھر آؤں گا... پھوپھی جان سے سب کہہ دینا۔ اچھا؟"
"بھولئے گا نہیں" وہ حیا آلود لہجے میں بولی "آپ کو تو معلوم ہے کہ میں کسی بھی طرح آپ تک نہیں پہونچ سکتی آپ ہی کو یہاں آنا ہے!"
"بس یہ سمجھو کہ اس طرح میرا آنا آخری بار کا آنا ہے!"
"آخری بار" رخشی گم صم سی ہو گئی۔
"ہاں" وہ اس کے خاطر ہنسنے لگا! "اس کے بعد تو تمہیں دلہن بنانے آؤں گا..."
"رخشی؟" اندر سے حاکم نے گونجیلی آواز میں پکارا "کواڑ بند کر دو! تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟"
"مرزا فیروز جی۔ باہر بھی تو آئیے" مبارز نے کہا۔

"اوہو۔ سرکار کی سواری ہے۔" حاکم ہنستا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ پھر رخشندہ سے بولا "تم جاؤ۔ کچھ شربت وغیرہ۔" وہ پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی ہنستی ہوئی بھاگی۔

"کیوں یار۔ خیریت۔" حاکم اس کے پاس بیٹھتا ہوا بولا "ایسی کڑاکے کی سردیوں میں لحاف میں کیسے نکلے؟!"

"کیا کرتا؟" وہ بگڑ کر بولا "مرتا ہوں اپنوں کے مارے۔ تمھیں میری پرواہ بالکل نہیں۔ تم بھلا ایسے موسم میں کیوں آتے مجھ سے ملنے۔ تم میرے ہوتے کون ہو..... لیکن تمھاری سنگدلی اور ناانصافی ہے کہ تم باپ کی سزا بیٹے کو دیتے ہو اور خوش ہوتے ہو!"

حاکم سنجیدہ ہو گیا "یہ تمھارا خیال ہے۔ رزمی۔ تم نے میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ شاید تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ اگر کوئی تمھاری خاطر مخالفتوں اور دشواریوں کے پل صراط پر سے گزر سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں؟ کیا میرے سلوک میں تم نے وہ سرد مہری دیکھی ہے جو تمھارے والد ماجد کا طرۂ امتیاز ہے!"

"تو تمھارا کیا مطلب ہے۔ یہی کہ ایک طرف کھائی ہو اور دوسری طرف خندق۔" بارز نے جلتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اگر تمھارا یہی منشا ہو تو میں بھی حتی الامکان محتاط رہوں گا۔"

"ارے کھانے والی باتیں نہ کرو۔" حاکم نے کہا "میں تمھاری مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔ اور سنو۔ رزمی۔ میں نے اس وقت کی بھی تمھاری تمام باتیں سن لی ہیں۔ مگر مجھے محترم ماموں جان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ تو شاید مجھے ٹکٹکی پر کسوا دیں گے۔"

مبارز کے چہرے پر شرم و حجاب کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا: حاکم۔ میں ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن مجھے... رخشی سے جدا مت کرنا۔ تم جانتے ہو بھائی۔ جو دلچسپی ہم میں ہے میں یا تو تمہارے یہاں آ کر رہ جاؤں گا یا پھر کہیں چلا جاؤں گا۔ حاکم میرے بازوؤں میں دم ہے۔ سینے کی گرمی ہے۔ کیا میں رخشی کو خوش نہیں رکھ سکتا!"

بے شک بے شک: حاکم نے کہا: "میں بالکل راضی ہوں۔ اگر خود مختار ہوتا تو ابھی اور اسی وقت تمہاری خوشی کر دیتا۔ لیکن رزمی دنیا سے ٹکر لینا اور بات ہے۔ تمہارے ابا جان سے ٹکرانا دوسری بات۔ میاں وہ تو سرمایہ دار ہیں!"

تم ان کا سرمایہ چھینتے کب ہو: مبارز نے کہا: "اچھا حاکم۔ اگر پھوپھی جان نہ مانیں یا پھوپھا جان نے کوئی مین میخ نکالی تو کیا ہوگا۔!"

جب تم سب سے ٹکرانے کی طاقت رکھتے ہو تو ہمیں کیا کرنا ہے۔ بھائی تم جانو کہ امی اور ماموں جان بھائی بہن ہیں۔ ان کی مخالفت اور چشمک دریا کی لہروں کی لڑائی ہے۔ ابھی لڑیں ابھی مل گئیں۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ رشتے ناطوں پر اگر دولت اثر انداز بھی ہو تو خدا کے بنائے ہوئے رشتے توڑ نہیں سکتی!"

رخشی لائم جوس لے آئی۔ سہ پہر تندرستی خوش گوار تھی۔ مبارز حاکم اور رخشی سے رخصت ہوا۔ وہ بے فکر اور لاپرواہ نظر آ رہا تھا!۔ سردار صاحب کا خوف بھی اس کے دل سے نکل گیا تھا اب اس کے جانے کے بعد حاکم نے اچانک رخشی سے پوچھ لیا۔

بپھریں گے کہ ان کے بیٹے کو تم نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے رجھا لیا۔ امی سے لڑیں گے۔ ابا کا جینا دشوار کر دیں گے۔ میں اپنی کسی کی یہ تذلیل برداشت نہیں کر سکوں گا۔ رخشی۔ کیا تم خود بھی گوارہ کر لوگی کہ لوگ تم پر انگلیاں اٹھائیں۔ تمہیں برا بھلا کہیں تمہیں اپنے قریب بھٹانے کے روادار نہ ہوں۔ رخشی۔ لاٹھی مارے پانی جدا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دن ایک وقت رزمی بھیا اپنے باپ کی طرف پلٹ جائیں۔ اس وقت تم کیا کروگی؟"

وہ کیا جواب دیتی؟ اسے تو اپنے بڑے بھائی کے سامنے آنسو بہاتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شام کو عاصم صاحب اور ان کی بیوی بھی پرسہ دے کر گھر آ گئے۔ نکہت اور اس کے شوہر عرفان بھی ہمراہ تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد حاکم نے مبارز کے آنے کی ساری روداد تفصیل سے سنا دی۔

"رئیس اعظم کے یہاں تو رزمی بھائی کا رشتہ لگا ہے۔" نکہت جل کر بولی۔ "پھر اب وہ ہم فلاکتوں کے ماروں کے یہاں کیا کرنے آئے تھے۔ خوشخبری سنانے آئے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ رخشی کو راضی کرنے۔" حاکم نے کہا۔ "وہ ایسے امیر ہیں جو بگلوٹ تک رہ کر جھونپڑے کے خواب دیکھتے ہیں۔ رخشی راضی بھی ہو گئی۔ لیکن مجھے منظور نہیں کہ ایک امیرزادے کی ہنگامی خواہش پر میری معصوم اور ناکردہ گناہ بہن بھینٹ چڑھ جائے۔"

"رزمی ایسا نہیں ہے۔" بیگم عاصم نے آہ بھر کر کہا۔ "وہ سچ مچ رخشی کو چاہتا ہے۔ جو اس نے تم سے کہا۔ یہ تو ہمارے بھائی صاحب کا دماغ الٹ گیا

کاش میرے بس میں ہوتا۔ میں اپنے بچے کی آرزو پوری کر دیتی۔ ہائے غریب۔ سوتیلی ماں سے دل کا حال کہہ نہیں سکتا۔ باپ جلاد ہے۔ ہم سب اس کے دشمن۔ جائے تو وہ محروم محبت کہاں جائے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں نصیب دشمناں وہ اپنی جان پر نہ بنائے!"

"دفع کرو۔" عاصم صاحب نے کہا۔ "ہمیں سردار صاحب کے صاحبزادے کی شادی وادی سے کوئی دلچسپی نہیں علاوہ ازیں میری بچی کوئی لاوارث نہیں ہے کہ ان کی آرزو پر قربان کر دی جائے...."

وہ لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ سرمئی شام کا دھندلکا در و بام پر پھیلنے لگا۔ نکہت نے بڑھ کر مدھم روشنی کا بلب آن کر دیا۔ ایک بیمار زرد روشنی نگی دیواروں پر پھیل کر ماحول کو زیادہ اداس بنانے لگی۔ حاکم اور زرینہ گھومنے چلے گئے۔ عاصم صاحب نے سگریٹ سلگایا اور نکہت سے سسر کے ماموں کی آبلہ فریبیوں کی داستانیں کہنے بیٹھ گئے۔ بیگم عاصم بے چاری کراہتی آہیں بھرتی اٹھیں اور کچن کی دیکھ بھال کرنے پہونچ گئیں۔ اس مظلوم اور ستم رسیدہ ہستی کا خیال کسی کو نہیں آیا جو زندہ مردہ بڑا برا، پھیری کی قبر میں دفن تھی۔ آنسو بہا رہی تھی اپنے نصیب پر۔ جو رات کی طرح سیاہ اور گورستان کی طرح ویران تھا۔

رہ رہ کر اسے مبارز کا چہرہ یاد آتا۔ کس طرح وہ بے بس انسان اچانک رونے لگا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی گرمی اب تک اس کی پیشانی پر زندہ تھی اس کی پر محبت انگلیوں کا لمس ابھی تک اس کے بالوں پر محسوس ہو رہا تھا اس کے قریب کی ہیجان انگیز مہک اس کے جذبات تک ابھی تک جوان تھی مگر وہ شخصیت اس سے بڑی دور تھی۔ جس کی یادوں نے رخشی کی زندگی کو

مرگ آسا کر رکھا تھا!

وہ تو یہ سوچ سوچ کر خون کے آنسو بہا رہی تھی۔ کہ مہارزا اس کے گھر سے نا امید ہیں گیا تھا۔ جب اس کو انکار اس تک پہنچے گا تو اس کا کیا حال ہو گا!۔

رات بڑھتی رہی۔ وہ روتی رہی!۔

کوٹھی میں سناٹا تھا۔ دھوپ ڈھلنے لگی تھی۔ باغ میں اونچے اونچے درختوں کی چوٹیاں سنہری کرنوں سے جگمگانے لگی تھیں۔ فواروں کی مترنم آواز خاموشی کا دل توڑ رہی تھی!۔

اپنے کمرۂ خاص میں سردار صاحب پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ ان کی مغرور پیشانی پر شکنیں تھیں اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ بیگم [illegible] دیوان پر نیم دراز تھیں!۔

آپ کچھ پریشان سے ہیں۔ مجھے اس پر یقین نہیں [illegible] وہ بولیں۔

سردار صاحب کی رفتار رک گئی۔ انھوں نے مڑ کر [illegible] آواز میں پوچھا۔ "یقین تو مجھے بھی نہیں تھا۔ مگر میں تم سے پوچھتا ہوں۔ [illegible] کا سبب کیا ہے؟"

آپ نے اپنی دانست میں [illegible] لڑکی بنا رکھی ہے۔" وہ [illegible] ہو کر بولیں۔ "ماشاءاللہ تیس برس کی عمر ہو رہی ہے [illegible] نے تو ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی سی زندگی کے گن گاتے ہوئے دیکھا۔"

میں نے تو نہیں دیکھا۔" وہ گرج کر بولے۔ "میں نہیں سمجھتا۔ اس لڑکی میں کیا خوبی ہے۔ مانا کہ وہ بچپن سے اس کی منسوب رہی ہے۔ لیکن... خیالات بدل بھی تو جاتے ہیں۔ اب اگر میں اپنے برابر کی کوئی عالی خاندان لڑکی اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ کیا برا کرتا ہوں۔"

"میرے ایک سوال کا جواب دیجئے گا۔"

"ہوں!" وہ اژدہے کی طرح پھنکارے۔

"بہو تو وہ بے شک آپ کی ہوگی۔ لیکن بیوی کس کی ہوگی؟ اس کے ساتھ ساری زندگی کون گزارے گا آپ یا رزمی؟"

"لا حول ولا قوۃ۔ عجیب حیا سوز بات ہے!" وہ پھر غصیلے انداز میں بننے لگے۔ "کیا یہ گناہ ہے کہ باپ اپنے بیٹے کے لئے اپنی پسند کی لڑکی تلاش کرے۔"

"میں نے آپ سے کہہ دیا۔" بیگم نے جواب دیا۔ "رزمی کو رئیس اعظم صاحب کی صاحبزادی پسند نہیں ہے۔ وہ تو یہی چاہتا ہے کہ اس کی شادی ــــ!"

"بس۔ وہ چاہا کرے۔ میں تو نہیں چاہتا۔ وہ ہم رتبہ نہیں ہے!"

"خدا کے آگے تو یہ نہ کہئے۔" بیگم نے غصے سے کانپ کر کہا۔ "آپ کی ہم رتبہ نہیں۔ وہ تو آپ کی سگی بھتیجی ہیں۔ آپ دولہ بہادر ہونے سے پہلے محض نواب انتخاب الدین تھے۔ آپ نے کیسے اپنے رتبے سے بڑھ کر عورت سے شادی کر لی۔!"

تب غضب کے مارے مرزا صاحب کا چہرہ تمتمانے لگا۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "تو یہ کہو کہ تم اس طرح اپنی دولت مندی کا طعنہ دے رہی ہو... یہ باغات۔ کوٹھیاں۔ مضافات کی جاگیریں۔ کیا یہ سب

تمھارے باپ نے تمھیں جہیز میں دیا تھا؟"

"بے شک! جب میں آپ کے یہاں آئی ہوں۔ میں نے کوئی کوٹھی۔ باغ گاڑی یا جاگیر آپ کی ملکیت نہیں دیکھی!"

"بیگم!" وہ اچانک دہاڑے۔

"میں اپنے بچے کی تباہی نہیں دیکھ سکتی! آپ کو اپنا مال و متاع مبارک مجھے میرا بچہ دے دیجئے۔ جو میں چاہوں اس کے ساتھ کروں!"

"خدا کی قسم۔ اب تو یہ ناممکن ہے!" انھوں نے ہتھیلی پر مٹھی مار کر کہا اور ایک غضب ناک نگاہ بیگم پر ڈال کر پھنکارتے ہوئے کمرے سے نکل کر چلے گئے۔ ثریا بیگم کا عجیب حال تھا۔ دل تھامے رو رہی تھیں۔ انھیں سچ مچ نواب صاحب سے محبت تھی۔ وہ بمشکل ڈیڑھ سال کا تھا جب وہ اس کی نئی ماں کے روپ میں آئی تھیں۔ کامل اٹھائیس سال گزر چکے تھے۔ نواز انھیں اپنی حقیقی ماں سمجھتا رہا! کوئی دکھ۔ کوئی راز اور کوئی بات اس کی ایسی نہ تھی جو بیگم سے پوشیدہ ہوتی۔ وہ دو قالب تھے مگر ان میں روح ایک تھی! پھر جھکے سے پردہ ہٹا اور نواز کی جھلک دکھائی دی۔ ثریا بیگم نے جلدی جلدی آنسو پونچھ لئے۔ مگر اس نے ان کے آنسو دیکھ لیے۔ اور ان کے پاس آ بیٹھا۔ رفتہ رفتہ اس کی مسرت بے تیل کے چراغ کی طرح بجھتی چلی گئی!

"ابا جان نے پھر کوئی بات آپ کی دل دکھانے والی کی ہے۔ امی؟" اس نے سر جھکا کر پوچھا۔

"میں تو اپنی دل آزاری کی عادی ہو گئی ہوں۔ نوزی۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ تمھاری دل شکنی ہو۔" وہ اس کا جھکا ہوا سر، آدم اندازاندر بجھا ہوا ہے

بچے کو لے کر اس پتھریلی قبر سے نکل جاؤں۔ پروردگار واقف ہے کہ اب دم گھٹا جاتا ہے!۔"

"ٹھیک ہے۔" انھوں نے جواب دیا "جیسی تمھاری مرضی۔ لیکن تمھاری آزادی میرے موت کے بعد ہی تمھیں نصیب ہو سکتی ہے۔ میرا ضد سے تم واقف ہو بیگم!۔ میں چٹان ہوں۔ جو ٹوٹ کر بکھر سکتی ہے اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتی!۔ میں جا رہا ہوں۔ خود کو قید ہستی سے آزاد کر کے میں تمھیں ابھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کر دوں گا۔ اب تو بات آپڑی ہے۔ یہی سہی!۔"

سنیے!۔ وہ [illegible] کیونکہ سردار صاحب بڑے [illegible] باہر ہو رہے تھے۔ بیگم کو بھی [illegible] نہ دشمن کے بچے اور نہ ان کے قاتل تھے۔ بے شک [illegible] تھے!۔

"ابا جان۔ یہ ظلم آخر کس [illegible] ہے؟" راہ میں [illegible] مبارز کھڑا ہو گیا۔ "بے شک ظلم ہے!۔ وہ نہایت خشک لہجے میں [illegible] جب میرے ظلم سے خدا تمھیں نجات نہیں دیتا تو میرا ہاتھ کس نے پکڑا ہے؟۔"

"صرف اسی لئے ابا جان کہ آپ کو اپنی مرضی اور خوشی پوری کرنی ہے!"

"بے شک!۔"

ابا جان... آپ کو اپنی زندگی مبارک۔ اپنی مرضی پوری کیجئے۔ ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا لینا میرے لئے بہت آسان ہے!۔" مبارز نے کہا اور ان کا راستہ چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"خدا کے لئے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجئے گا۔" ثریا بیگم نے کہا۔

خوش ہو جائیے اس غریب نے آپ کی مشکل آسان کر دی۔!"

اور بھی بہت سے جلے کٹے فقرے ان کی زبان سے نکلے مگر انھیں سننے کی زحمت کس نے کی؟ سردار صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر چلے گئے!۔

ثریا بیگم مبارز کے کمرے میں آئیں۔ وہ دریچے سے لگا کھڑا باغ کی ویرانیوں میں نجانے کون سی دلکشی ڈھونڈ رہا تھا۔ آہٹ سن کر مڑا اور اس کے سنجیدہ چہرے پر ایک مضمحل شکست خوردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بس امی۔ اب دل سے سارے غم نکال دیجئے!" وہ عجیب ہنسی ہنس کر بولا "آپ سوچیے نا۔ آخر غم کس بات کا۔ انسان مشیت کے آگے بے بس ہی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی یہی مرضی ہو۔ دعا رخشی کے لیے کیجئے اسے کوئی صدمہ نہ ہو۔ امی۔ جو کچھ میرے دل پر گذر رہا ہے کیا وہ سب کچھ اس کے دل پر نہیں گذرے گی۔ یہ حالات ہیں [illegible] مقابلہ کر سکتا ہوں مگر وہ معصوم سی بے گناہ لڑکی۔ وہ تو [illegible] کتنی بڑی سزا بھگتے گی امی۔ اگر زندگی کی راہوں پر کبھی ہمارا آمنا سامنا ہو جائے گا۔ تو۔ میں کون سی صورت اسے دکھاؤں گا۔ امی۔ بدنصیبی۔ ابا جان سے خود کشی کروا رہی ہے۔ بدعہد تو میں بھی ہوا پھر میں کیوں زندہ ہوں؟"۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ رزمی" انھوں نے تڑپ کر کہا "کیا تم بھی کوئی دکھ مجھے پہنچاؤ گے رزمی۔ میں نے تمھیں دودھ پلایا ہے۔ اس دودھ کی تم کو قسم ... مجھے کوئی غم نہ دینا۔ نہ رلانا مجھے۔ میرے بچے...!" یہ کہہ کر انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ثریا بیگم اسے سمجھاتی رہیں۔ ہر قسم کا دکھ آدمی کے ہی لیے ہے۔ اللہ طاقت سے بڑھ کر تکلیف کسی کو نہیں دیتا۔ اگر [illegible] سمجھا دے

بے افراط سرمایہ۔ ان کا دل الٹنے لگا۔ بے شک وہ آل اولاد گھر بار
سب کچھ بھول سکتے ہیں۔ مگر یہ قد آدم تجوریاں نہیں چھوڑ سکتے۔ دنیا میں
غیرت مندوں کے لئے جگہ نہیں۔ وہ غیرت کرتے رہ جائیں تو بھوکوں
مر جائیں۔ بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن۔ پی گئے۔ بیوی کا طعنہ۔ اور جیسے
اس بات کو بھول ہی گئے۔ شام کو بہت سے اعلیٰ اور قیمتی زیورات بیگم
کی خدمت میں بھیجے۔ ساتھ ہی ملازم سے کہلوا دیا کہ کل تیاری کر لیں۔

"دور کلو ہے۔" انھوں نے جھڑک کر لڑکے سے کہا۔ اور زیوروں کا ڈبا
کر فرش پر پھینک دیا۔ لیکن سردار صاحب کا نادری حکم۔ انھیں تیار ہو
[illegible]نا ہی پڑا۔ اس دن کوٹھی میں خوب رونق تھی۔ اندر باہر چراغاں ہو
رہا تھا۔ سردار صاحب شاید اسی طرح بیگم کے سینے کا عذاب دیکھنا
چاہتے تھے۔ [illegible] کی خوشی سے انھیں جلائیں۔ زینوں پر اور برآمدوں
میں روشنی کا [illegible] تھا۔ لان پر آرکسٹرا مدھم سروں میں خوشی کے نغمے
بجا رہا تھا! لیکن پر تکلف میں بھی تنہائی ناچ رہی تھی۔
رفتہ رفتہ مہمانوں سے کوٹھی بھر گئی۔!

مبارز اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کتنا بھیانک خواب ہے!
اس کے [illegible] نیا لباس رکھا تھا! عجیب سی وحشت اس
کی آنکھوں سے عیاں تھی۔
[illegible] کی مرضی۔ اس کی آرزو۔ وہ پاگلوں کی طرح
[illegible] کے آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ سسکیوں سے
رو رہا تھا۔!

"[illegible]۔ تم تیار ہو گئے؟" باہر سے کسی نے آواز دی۔

"جی ہاں... آ رہا ہوں۔" اس نے ہڑبڑا کر کہا اور جلدی جلدی آنسو پونچھ لیے۔ پھر بڑی تیزی سے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اتنے میں پھر کسی نے اسے پکارا۔ اب کی وہ خاموش ہی رہا۔ تیسری بار اسے ثریا بیگم نے مخاطب کیا۔ مجبوراً اس نے دروازہ کھول دیا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ بے تاب ہو گئیں۔

"امی اب بھی سویرا ہے۔ ابا جان سے کہیے مجھ پر رحم کریں۔" اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "امی وہ مجھے بے وفا۔ مکار۔ دھوکے باز کہے گی۔ بددعائیں دے گی۔ کوسے گی۔ اس کی آہیں مجھے چین نہ لینے دیں گی۔ امی۔ ان سے کہیے۔ [illegible] رحم کریں۔"

"اس گھر سے۔ اس شہر سے۔ کہیں بھاگ جاؤ رزمی۔ اب میرے بس میں کچھ بھی نہیں۔"

"امی جان"

"میرے بچے۔ کاش میں تیرے کام آ سکتی!"

"خداوندا۔ مجھے صبر عطا کر۔!"

"رزمی!" برآمدے میں سردار انتخاب الدین کی بارعب آواز گونجی۔ "تم ابھی تک باہر نہیں آئے۔"

[illegible] پرنم آنکھیں ملیں۔ اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "گھر سے بھی جاؤں گا۔ اور شہر سے بھی۔ مگر ابھی نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "اس بے رحم ہستی کو بھی پتہ چلے کہ جدائی کیا چیز ہوتی ہے!"

اس نے طوعاً و کرہاً بلکہ بڑی کراہیت سے نیا لباس پہنا۔ اور ثریا بیگم کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اتنی دیر لگا دی ؟" سردار صاحب نے پُر نفرت لہجے میں کہا "کہا تم دونوں گلے مل کر رو رہے تھے! ؟"

ہنس رہے تھے۔" ثریا بیگم کے لہجے کی تلخی۔ خدا کی پناہ "الٹرنٹ آپ کی زندگی میں یہ خوشی کا موقع آیا۔" مبارز کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا! ۔اس نے ان دونوں کی جلی کٹی نوک جھونک ابھی نہیں سنی جلدی سے باہر چلا گیا۔

رات کے دس بجے کے قریب بڑی دھوم دھام سے اس کی منگنی کی تقریب انجام کو پہنچی! شادی کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ اور لگ بھگ بارہ بجے سارے مہمان رخصت ہوئے۔

مبارز باغ کی تاریکیوں میں نکل آیا۔

اس کی گاڑی باغ کے گیٹ پر کھڑی تھی۔ اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی۔ لیکن ایک سڑک پر سے کسی نے تیز روشنی والی ٹارچ اس کی کار کے سامنے روشن کی۔ روشنی کے دائرہ میں اسے اپنے باپ کا دیو ہیکل سایہ نظر آیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ پاس آئے۔ مبارز کا خون کھولنے لگا۔

"ابا جان۔ اب کیا میں اپنی مرضی سے کہیں آ جا بھی نہیں سکتا۔

"تمہاری مرضی کیا چیز ہے۔ واپس چلو۔!"

"ابا جان ؟"

ہاں۔ بیٹے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔" وہ بولے "گھومنے پھرنے کا وقت صبح کا اچھا ہوتا ہے۔" مبارز نے نہیں دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے کس طرح انھوں نے بھینچ کر دانت پیسے تھے!۔ وہ پگھل گیا۔ اپنے

معصوم مظلوم بچے کو اپنے بچوں کے ساتھ رکھنے پر آپ روادار نہ ہوئے
چھوٹے بھیا کی بیوی تیز مزاج تھیں۔ رزمی کو ان کے یہاں بھی پناہ نہ ملی
بڑی آپا کے یہاں اولاد بکثرت تھی۔ کیا وہ اپنے چھوٹے خالہ زاد بھائی
کے دودھ پیتے بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر پناہ نہیں دے سکتی تھیں؟ جب سب
نے بھائی صاحب کو ٹھکرا دیا [illegible]۔ انھیں اگر پناہ دی تو ثریا کے
والد نے۔ وہ ان کے عزیز نہیں تھے۔ مگر انسانیت کے ناطے وہ
سب سے بڑھ کر عزیز بن گئے۔ ثریا انھیں دنوں بیوہ ہوئی تھیں۔
ان کی گود کا بچہ جاتا رہا تھا۔ انھوں نے رزمی کو سمیٹ لیا۔ اپنا دودھ
پلایا۔ اسے اپنے معصوم بچے کا نعم البدل سمجھا۔ مجھے بتائیے۔ اگر
بھائی صاحب اب سب سے برگشتہ رہتے ہیں۔ تو کیا برا کرتے
ہیں۔ انسان اگر قدرت پر اپنا انتقام نہ چھوڑے تو جب کبھی اس
کی باری آئے وہ اپنا بدلہ لے ہی لیتا ہے۔ میں بھائی صاحب کو
بے قصور سمجھتی ہوں۔ مجھے تو رزمی اور رخشی کی منگنی پیاری تھی اور
آج یہ سبھی ناطے بھی ٹوٹ گئے!"

مگر رخشی نے کیا خطا کی تھی۔ امی [illegible] کے لہجے سے [illegible]
[illegible] تھی۔ "امی جان نے تم [illegible] اس کا پاس [illegible]!"

"رزمی کی کیا خطا تھی! اسے تمھارے یہاں پناہ نہ ملی۔ آدمی آدمی
ہے کوئی فرشتہ یا پیغمبر نہیں ہے جو وہ اپنے پرائے [illegible]
اور زیادتیاں بھول جائے۔ تمھارے ماموں جان کی باتیں ابا آج تک
تمھاری ماں پاگل ہو گئی ہیں۔" نسیم صاحب [illegible]
کی طرف مڑتے ہیں۔ میاں۔ ان سے بحث بے کار ہے۔ جو کچھ ہوا۔

سب ٹھیک ہوا۔ غالباً وہ سمجھتے ہیں کہ میری لڑکی یونہی بیٹھی رہ جائے گی۔ لیکن یہ تو ان کی ناسمجھی ہے!۔

منگنی کا اعلان کیا تھا۔ گویا ایک بم تھا جو ان سب پر پھٹ گیا تھا اور دل و دماغ کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ حاکم پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ عاصم صاحب کی گالیاں جنھیں سن کر شیطان کے کان بہرے ہو جائیں۔ البتہ وہ بے قصور سب سے الگ تھلگ تھی۔ جس کی چھوٹی پیاری دنیا اجڑ چکی تھی۔ وہ تو کئی دنوں سے مسلسل رو رہی تھی۔ جو کچھ وہ سوچ رہی تھی وہ اس کے سامنے آگیا تھا۔ اتنے دن اس نے آس لگائے رکھی۔ اس کی نگاہیں دروازے سے نہ ہٹیں۔ [illegible] میں [illegible] کا دل نہ لگتا... ایک چراغ تھا جو اس کے دل میں جل رہا تھا۔ آج وہ بھی بجھ گیا اور زندگی اندھیروں میں ڈوب گئی۔

دن بڑا سوگوار گذرا۔ رات چھیا تک آئی۔ وہ دریچے کے قریب آ بیٹھی۔ اور سیاہ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں پر نگاہیں جما دیں۔ سب روشنیاں ڈوب گئیں۔ لیکن ان کی روشنی نہیں ڈوبی۔ [illegible] کی آنکھوں سے پھر موتی بکھرنے لگے۔ اے پروردگار۔ مجھے سکون عطا کر۔ برداشت نہیں ہے۔ اب انتظار کی بھی تاب نہیں!۔

"رخشی!"۔ اس نے اپنے بھائی کی گونجدار آواز سنی اور دریچے سے سر اٹھایا۔

"تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم اس وقت بھی رو رہی تھیں۔" ان کے لہجے میں ملامت تھی۔

"بھیا۔ میرے آنسو بہانے پر۔ پابندی نہ لگائیے۔ اب تو یہی

سے جی بہلتا ہے۔"

"پاگل ہیں۔ امی نے اور زیادہ تمھاری زندگی ناسور بنا رکھی ہے۔ ہر وقت اپنے لوگوں کی تعریفیں کرتی رہتی ہیں۔ رخشی تم نے دیکھا کہ انھوں نے اس موقع پر بھی ہم میں سے کسی کو مدعو نہیں کیا۔"

وہ چپ رہی۔

"ہم یوں بھی ان کے جنازے میں شریک ہونے نہ جاتے۔ لیکن رسمِ دنیا تو تھی۔" حاکم یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

"اللہ اللہ۔ موت مانگنے سے کیوں نہیں آتی۔"

"بیٹی تم ابھی تک سوئیں نہیں؟" ماں کی نحیف اور پژمردہ آواز سن کر رخشندہ نے اپنے آنسو پونچھ لئے وہ ان کے سامنے بے حجاب بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یوں بھی زیادہ تر بیمار ہی رہتی۔ رخشندہ کی اداسی انھیں اور بدحال کر دیتی۔ اس نے لہجہ سنبھال کر کہا۔

"گرمی اتنی ہے امی۔ نیند نہیں آتی!"

"بیٹی تو پھر برآمدے میں پلنگ نکال لیتیں۔ میں بھی وہیں پڑ رہتی۔ آج تو عجیب طرح دل ڈوب رہا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔"

"کیوں امی۔"

"بی بی پچھلی یادیں جان کا عذاب ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "مجھے تو ہمیشہ ہی خیالوں نے مار رکھا ہے۔"

"امی آپ یوں نہ سوچا کیجئے۔" وہ بے چین ہو کر بولی۔ "خود کو ہر وقت ہشاش بشاش رکھئے۔ خیال تو کیجئے امی آپ کے سوا میرا کون ہے!"

"تمھاری ہی ذات نے مجھے زمین پر کھڑا رکھا ہے۔ بیٹی۔ ورنہ میں

وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی ۔

پہلے پہل تو وہ اس دستک کو اپنا واہمہ سمجھی۔ لیکن دوبارہ ایک جانی پہچانی آواز اس کے نہاں خانۂ دل میں گونجی "رخشی! کھولو دروازہ۔ میں بڑی دیر سے یہاں کھڑا ہوں۔"

اس لہجے نے اسے بے ضبط کر دیا۔ وہ بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں دو سائے آپس میں ایک ہو گئے۔

"رخشی!" رزمی نے گریہ آلود آواز میں پکارا۔

"آپ نے تو وعدہ کیا تھا!"

"رخشی۔ میرے ساتھ چلو" اس نے اپنے لب اس کی آنکھ پر رکھ دیئے اور بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ "امی نے سارا انتظام کر دیا۔ یہاں سے واپس جا کر ہم مسجد میں نکاح کر لیں گے۔ صبح ہوتے ہوتے یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ امی کے بھائی دکن بیدر میں بھی ہیں۔ انھوں نے انھیں تار دے دیا ہے۔ ماموں جان ہمارے منتظر ہوں گے۔ ذرا سی ہمت کرو رخشی! ہمارے بعد طوفان اٹھے گا پھر خود بخود بیٹھ جائیں گے۔"

رخشندہ اس کے سینے سے الگ ہو گئی اور حیرت بھری نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔

"دیر نہ کرو رخشی! پھر ایسا وقت نہیں آئے گا۔ یہ آخری لمحے ہیں۔"

"بھاگ جاؤں آپ کے ساتھ؟" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں رخشی۔ خدا کے لئے مجھے تنہائی کی موت مرنے سے بچا لو۔"

"لوگ کیا کہیں گے۔ ابو کو خودکشی کرنی پڑے گی۔ بھیا کسی کو کیا منہ دکھائیں گے۔ امی تو مر ہی جائیں گی۔ ساری دنیا کہے گی رخشی بھاگ گئی۔"

"تم ہی بتاؤ۔ رخشندہ۔ ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کا پھر کوئی دوسرا طریقہ؟"

"آپ کی تو منگنی ہو چکی۔"

"وقت نہ خراب کرو۔ رخشی۔ ڈیڑھ بج چکے۔ منگنی ہی تو ہے چیز کیا!"

"مگر آپ کے ابا۔۔!"

"اُف تو۔۔ رخشندہ۔ تمہارے اندیشے۔" وہ بے قرار ہونے لگا۔ "میں تو اس خوش فہمی میں تھا کہ تم میرے انتظار کی کٹھن گھڑیاں گنتی ہوگی۔ تمہاری نیند پرواز کر گئی ہوں گی۔ تم مضطرب اور بے تاب ہوگی رخشی!۔ جیسا کہ میں تو میرے دل کی حالت، کہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اگر اباجان خودکشی کی دھمکی نہ دیتے تو میں کب اس منگنی پر راضی ہوتا۔ یہ سب ڈھونگ ہے۔ رخشی۔ چلو۔ اب کچھ نہ سوچو۔!"

"میرے لئے آپ سب کو چھوڑ دیں گے۔ گھر بار۔ ماں باپ؟"

"گھر بار شہر اور باپ اور اس کی دولت۔ مگر ماں کو نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ میری جنت ہیں۔ انہیں ساتھ لے چلوں گا۔ میری اور تمہاری خاطر وہ شہر کو چھوڑنے پر تیار ہیں۔ یہاں سے ہم پہنچیں گے اور ہماری روانگی کی خبر پاکر وہ دوسرے دن پہنچ جائیں گی۔"

"پھر۔ میری امی ابا؟"

"خدا کی قسم۔ اگر وہ راضی ہوں تو میں انہیں بھی اپنے پاس لے آؤں گا۔"

وہ عجیب سی کشمکش میں گرفتار اُس کا چہرہ تکنے لگی۔

"چلو۔ رخشی!۔ خدا کے لئے چلو۔ دیر نہ کرو۔!"

دفعتہً سڑک پر پہریدار چیخا۔ "ہوشیار!" اور سہم کر رخشندہ

رزمی کے سینے سے لگ گئی۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں یخ کی طرح سرد تھے۔ رزمی نے اسے جکڑ لیا۔ اس کی سانسیں پھولنے لگیں!

"وہ ادھر ہی آ رہا ہے" رزمی نے سرگوشی کی "رخشی جلدی کرو۔!"

رخشندہ نے سوچے سمجھے بغیر اس کے ساتھ قدم بڑھا دیئے۔

"رخشی؟"

وہ کانپ کر اس کی شکل تکنے لگی۔

"تم خود کو مجبور تو نہیں سمجھ رہی ہو؟"

وہ مدہوشی میں ہنس دی "آپ کے ساتھ ہی جینے اور مرنے کی قسم کھائی ہے!"

"کون ہے؟" اچانک کھڑکی سے سر نکال کر حاکم دہاڑا۔ رزمی کے ہاتھ سے رخشی کا ہاتھ نکل گیا۔ وہ موم کی گڑیا کی طرح جہاں کی تہاں کھڑی ہو گئی۔ حاکم کھڑکی سے کود کر ان کے قریب آ گیا اور صورت حال کی ساری... نزاکتوں کو بھانپ گیا۔

"رزمی۔ تم۔ اور اس وقت؟" اس کے لہجے میں درشتی اور قہر تھا!۔

"حاکم۔ تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا!" رزمی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"یہی تو مجھ سے بھول ہوئی" حاکم نے قہر آلود آواز میں کہا "یہ یاد رکھو سبارز! میں اگر مفلس ہوں تو اپنی جگہ۔ لیکن بہن کی عزت و آبرو کی خاطر میں تم جیسے ہوس پرست امیر زادے کے منہ پر تھپڑ بھی مار سکتا ہوں!"

"حاکم!" رزمی کی آواز غصے کے مارے بدل گئی۔

اور تم۔ حاکم زخمی شیر کی طرح رخشی کی طرف مڑا۔ ننگ خاندان

"یہ کیا درندگی ہے۔" رزمی غیظ و غضب میں کانپتا ہوا بولا۔
"یہ درندگی ہے؟" حاکم ہانپتا ہوا بولا۔ "شہزادے صاحب۔ رات کی
تاریکی میں کسی کی عصمت و آبرو لوٹنا درندگی نہیں ہے؟؟ رزمی۔ رحم کرو
میری بہن پر۔ وہ تمہاری ہوس کی بھینٹ نہیں چڑھے گی۔ رزمی۔ جاؤ۔
قبل اس کے کہ میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے۔ خدا کا واسطہ تم کو۔ جاؤ۔
چلے جاؤ۔ تم کو اپنی ماں کی عزت کا واسطہ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔!"
مبارز نے کان بند کر لئے۔ حاکم اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ رخشندہ
ابھی تک در میں بیٹھی تھی۔۔ جیسے مٹی کا ڈھیر۔! مبارز نے بھرائی ہوئی آواز
میں کہا۔ اچھا۔ رخشی۔ خدا حافظ۔ یاد رکھنا کہ میں نے بے وفائی نہیں کی"
پھر اندھیرے نے اسے نگل لیا۔
رخشندہ۔" حاکم اس کے پاس آیا اور بازو پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔"
تم اتنی ناعاقبت اندیش ہو گئیں۔

"بھیا آپ جانتے ہیں۔ میں ان کے بغیر۔!"
"یہ تم نے نہیں۔ میں نے گوارہ کرلیا۔!" حاکم نے کپکپاتی ہوئی آواز
میں کہا۔ "مجھے سب منع کرتے تھے۔ امیر غریب کبھی نہیں ملتے ہیں اور اگر ملتے ہیں
تو یہی ہوتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں گناہ پلتے ہیں۔ اگر تم چلی جاتیں
تو صبح کو کون سی قیامت ہمارے گھر میں آتی ... میں نے اتنا پر کھ [illegible]
کیا۔ اس نے میرا گلا گھونٹا۔ رخشی۔ قصور تمہارا نہیں۔ میرا ہے۔ خدا مجھے [illegible] دے"
یہ کہہ کر اس نے اپنے گالوں پر تھپڑ رسید کرنے شروع کر دئے۔ [illegible] پھر
ایک دو تھپڑ [illegible] جمایا اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رو پڑا۔
رخشندہ دم بخود کھڑی تھی!

"مبارک ہو!" حنا نے چپکے سے اسے گدگدایا اور وہ چونک کر سے
دیکھنے لگی۔ مانجھے کے زرد زرد لباس میں اس کا بھولا بھالا چہرہ ڈوبتے
چاند کی طرح پژمردہ نظر آرہا تھا!

"گاؤ۔ مسکراؤ۔ محفلیں سجالو۔!" حنا نے بڑے عبرت انگیز انداز سے
کہا۔ "پھر تم کہاں اور ہم کہاں۔ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔" وہ
موقع بے موقع شعر پڑھنے کی بڑی شائق تھی۔

"تم اکیلی ہو۔ اور کوئی نہیں آیا؟" اس نے زردگی سے پوچھا۔

"اوہ۔ شبی! وہ لولا لیول میں بھر کر آرہی ہیں۔" حنا نے کولہوں پر
ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مگر تمہاری محبت کی کشش نے مجھے کچے دھاگے سا
باندھ کر کھینچ لیا۔ رات کو میں ہراس سے آئی اور جب سنا ابا
شبانہ دلہن بننے والی ہے تو اپنی تو گویا ساری شان کافور ہو گئی۔ سب کرنا
شاہد کا دانا تھا جو تھے شہر کا۔ صبح ہی کوٹھی سے کہہ کر بھاگی آئی۔ اب
تو تم سناؤ ذرا۔ کہاں لاسے پھنسایا۔ سنا ہے کہ بڑا خوبصورت جوان
ہے۔ ڈیئر۔ اسے کہتے ہیں لکی چانس!"

"ہائے اللہ۔ تم جیسی ڈائریکٹ کرنے والی کو بولنے کی طرح بات
چیت سیکھنے۔" شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔ "جیسے کتنی سیدھی سادی
ہوتی تھیں۔"

حنا اس کے پہلو میں بیٹھ کر بیٹھ گئی! اور اس کے زرد زرد ہاتھ

ہار پھول دیکھ کر بے ساختہ ہنسنے لگی۔ "میرا خیال تھا کہ گریجویٹ ہو کر تم یہ لغویت نہیں کرو گی۔ غالباً مائیوں بیٹھی ہو۔"

"ہٹو بھی۔ ایسا بننا کیا۔" شبانہ چڑ گئی۔ "جیسے کہ آج تک تم نے کوئی شادی بیاہ دیکھا ہی نہیں۔ باجی کی شادی میں تو تم بھی شریک تھیں!"

"ہاں جب تو ہم تم انڈے کی زردی بنے ہوئے تھے۔" حنا نے قہقہہ لگایا۔ "مگر اب۔ دو سال میں امریکہ میں رہی۔ ڈھائی سال سے مدراس میں ہوں۔ وہ وہ رنگ اور فیشن دنیا کے دیکھے ہیں کہ یہ زرد رنگ یہ شرم و حیا یہ ہار پھول سب مذاق معلوم ہوتے ہیں۔ خیر ہٹاؤ۔ اصلیت تو یہی سب کچھ ہے۔ تم اپنی سناؤ۔ کہاں جا رہی ہو؟"

حنا شبانہ کی بہت پرانی سہیلی تھی۔ شبانہ نے گریجویٹ ہو کر تعلیم ترک کر دی تھی۔ مگر حنا پڑھتی چلی گئی۔ مدراس یونیورسٹی میں انگریزی صحافت کی پروفیسر تھی۔ نہایت بے باک، دلیر اور گھومنے پھرنے کی شوقین۔ چلبلی لڑکی تھی۔ ہنسنے کی عادی تھی اور زندگی کی کسی سنجیدگی سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔

شبانہ نے اس کی فرمائش پر اسے سب کچھ کہہ سنایا۔ پھر اس کی ہنسی پر جھنجھلا کر بولی۔

"اچھا بس زیادہ بیوقوف نہ بناؤ۔ مجھے بھی پتہ ہے۔ کبھی نہ کبھی کسی کو تو بس شوہر ورا بنا کر رکھنا ہے۔ اکیلی آدمی ہو۔ بھلا کیسے گذر ہوتی ہو گی؟"

"بھئی اکیلے آدمیوں کی گذر بسر تو بس شاہانہ ہے۔ ہم کو کوئی نہ ہو یا کوئی۔ جیسے خوش رہے اور پھر ٹھنڈے ٹھنڈے چل بھی دیے۔ مجھے بچوں کی چخ چخ میاں کی جی ہاں بوجھی معتبری سے بڑی نفرت ہے۔ اگلے سال تک

تم بھی اللہ رکھے والدہ محترمہ بن جاؤ گی۔ کیوں؟"

"معلوم نہیں۔" وہ جھلا گئی۔

"دولہا میاں کی کوئی تصویر نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"ڈیڈی کے پاس آئی تو تھی۔ میں بھلا اپنے پاس کیوں رکھتی؟"

"ہائے ایک نظر دکھاتی تو سہی!"

اتنے میں برآمدے سے گنگا جمنی جھنجھول اور نازک نازک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ حنا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "لیجیے آ پہنچا۔ نیا حسین دستہ۔ اب میں تو چلی۔ کل آنے کی کوشش کروں گی۔"

شبانہ بھی سنبھل گئی۔ ذرا سی دیر میں کمرہ جگمگانے لگا۔ قہقہے، آوازے، فقرے بازیاں۔ وہاں کیا نہ تھا۔ حنا شبانہ سے مل کر چلی گئی۔ لڑکیاں ڈھولک پر جھک گئیں۔ کوئی ستار بجانے لگی۔ کسی نے گانے کے بہانے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیا۔

سحابی شبانہ کی بڑی گہری دوست تھی وہ اس کے پاس آ بیٹھی اور شبانہ کے گلے کا ہار دیکھنے کے بہانے اس کے پاس جھک آئی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔

"شبی۔ کیا یہاں شکیل آئے تھے؟ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑے دیکھا تھا۔ اتنی حسرت اور بے چارگی ان کے چہرے پر برس رہی تھی کہ تمہارے پاس آنے کی خوشی کافور ہو گئی۔"

شبانہ کی آنکھیں یکبارگی جھلملانے لگیں۔ وہ مجبوری سے ڈبڈبا دیے گئے۔ سحابی ان کی خاموشی سمجھ گئی [illegible] بے روزگار نہیں تھے۔ وہ [illegible] سے منسوب کر دیا گیا؟

میں شامل کرلیں۔ مگر ڈیڈی نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ ہم میں عقیدے اور
مسلک کا بھی فرق ہے۔ ہم کٹر سید ہیں اور وہ پٹھان۔"

"خدا نے سب بندوں کو ایک جیسا پیدا کیا ہے۔" سحابی نے جواب دیا
سب کے مرنے جینے کے طریقے ایک ہیں۔ پھر یہ نسلی، مذہبی، معاشرتی امتیازات
کی فولادی دیواریں انسانوں نے اپنے ہی جیسے دوسروں کے درمیان کیوں
کھڑی کر دی ہیں؟ سب کا مسلک محبت ہے۔ جہاں محبت کارفرما ہوتی ہے
نفرت کا قدم آپ ہی آپ اکھڑ جاتے ہیں۔ مگر انسان انسان سے محبت کرنا ہی
جانتا کوئی خود غرض ہے تو کوئی مصلحت آمیز۔ محبت پرستی بھی لوگوں کا ایمان بن
گیا ہے۔ دراصل آدمی کو آئینہ میں اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے
جیسا ڈھونگ محبت کا میں نے رچا رکھا ہے۔ اسی طرح دوسرے نے بھی رچایا
ہوگا۔ خواہ دوسرا اپنے جذبے میں کیسا ہی مخلص کیوں نہ ہو کسی کو یقین
نہیں آتا... آہ سحابی۔ بہت سے دل صرف خود غرضی نے توڑے ہیں۔ بہت
سے محبت نسل کی مصلحت پسندی نے ڈھائے ہیں۔ کب یہ دنیا محبت
کا پرندہ حیات ہوگا۔ کب آدمی آدمی کو پہچانے گا۔ کب وہ وقت آئے
گا جب دل ملیں گے۔ جدا نہ ہوں گے۔"

"یہ دنیا کیا رازداریاں نہ رکھتی ہیں" نازنین نے ہانک لگائی۔
"مجھے جینے کی کوئی آس نہیں۔ سحابی!" شبانہ نے آہ بھر کر کہا۔ "یقین کرو
شادی مجھے پہاڑ سی لگ رہی ہے۔ یہ سوچ کر کہ پرائے گھر جا کے میں
تمہارے ساتھ بیتے لمحوں کی یاد اپنے دل میں چھپائے دوسرے مرد کو کیسے تن من
کا مالک بنا سکوں گی۔ کیا ساری زندگی ہی میری ریاکاری میں کٹتی چلی جائے
گی؟ مجھے اپنے جذبات کے چھپانے کا ذرہ بھر سلیقہ نہیں۔ اگر کبھی وہ

پہچان گئے۔ عمر بھر تو ساتھ رہنا ہے۔ پھر کیا ہو گا۔"

"اب کیا ہونا ہے۔ سب کچھ ہو چکا۔ دل کو مضبوط کرو۔ اور یہ سوچ لو کہ
خواہ تم اس گھر میں جی نہ سکو مگر مرنا تمہیں وہیں ہے۔ جہاں اتنی محرومیاں
وہاں ایک اور سہی۔ کیا بڑا فرق پڑ جائے گا۔"

اور شبانہ نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مجھے مرنا
ہی ہے۔ مگر سحابی... تم اگر کبھی میرے بعد شکیل سے ملنا تو انہیں دست بستہ
میرا پیغام پہونچا دینا کہ خدارا وہ زندگی میں کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش
نہ کریں۔!"

"بے چارے!"

پھر سحابی اٹھ کر باہر کی تیاریاں دیکھنے چلی گئی۔ تنہائی شبانہ کو ڈسنے
لگی۔ وہ بہت ترقی پسند اور روشن خیال خاندان میں پلی بڑھی تھی۔ لیکن
عجیب سی محجوب اور حیا پرور تھی۔ جیسے چھوئی موئی ہو۔ اتنی ڈرپوک سی
کہ غیر معمولی آہٹ پر سہم جاتی! کسی کو اپنے سے برگشتہ دیکھ کر بہر دل
کڑھا کرتی۔ بات بات پر اس کی خواہ مخواہ دل شکنی ہوتی تھی۔ وہ جتنی حساس
تھی اتنی ہی جذباتی تھی۔ اس کے ڈیڈی اپنی لاڈلی اور چہیتی بیٹی کی افتادِ طبع
سے متفکر رہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شبانہ ذہنی بیمار ہے۔ جو بندر سے
ڈرے۔ چھپکلیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ کسی کی انگلی سے خون بہتے دیکھ
کر بے ہوش ہو جائے۔ وہ ہرگز دماغی طور پر صحت مند نہیں کہلایا جا سکتا
ان کے اور لڑکے بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے۔ لڑکیاں اعلیٰ خاندانوں میں
بیاہی گئی تھیں۔ سب نارمل زندگی بسر کر رہے تھے! ایک شبانہ ہی تھی جو سب
سے چھوٹی۔ سب سے عجیب۔ بہن بھائی اسے بے پناہ چاہتے تھے۔ ال

وہ دیکھتا رہا کہ کس طرح نت نئی چمکیلی اور خوبصورت کاروں کے قافلے کوٹھی میں آتے رہے۔ رنگ برنگی جھنڈیاں حد نظر تک لہرا رہی تھیں۔ ان پر دستیاں ہو رہی تھیں۔ بے شمار اقسام کی گارڈن چیرز دور دور تک پڑی ہوئی تھیں۔ شہر کے تمام امراء و رؤسا اور عمائدین مدعو تھے۔

وہ اپنی نظروں میں آپ گرنے لگا! ۔ بے شک وہ کالج کا ہونہار و مغز۔ ذہین ترین طالب علم تھا! حسین تھا! ۔ شریف اور مہذب تھا! ۔ لیکن امیر کبیر نہیں تھا! ۔ وہ بہت کمتر اور چھوٹا تھا۔ توصیف الرحمن بہت برتر اور بلند تھے! ۔

ایک بار اور آخری بار اس نے بالکنیوں پر نظریں دوڑائیں جہاں کبھی شبانہ کھڑی ہو کر اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہتی تھی ۔ اور پھر سر جھکا کر ان راہوں پر سے چلا گیا! ۔

کبھی دوسرے کی خوشی اپنا غم بن جاتی ہے۔

رات کو حنا بھی آئی ۔ اب کی اس کی سج دھج اور تھی۔ نہایت زرق برق لباس پہنے تھی۔ گردن پر بڑا سا جوڑا رکھا ہوا تھا۔ جس پر پھولوں کا گجرا بندھا تھا! ۔ عطر کی مہک رہی تھی! ۔ بہتیری خواتین کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں! ۔

خدا خیر کرے تو وہ اندر آ کر شبانہ کے پاس گر پڑی اور جھاڑی پر سے سینہ پر اچھال دیا۔ نادرے کس بری طرح وہ عورتیں تجھے گھور رہی تھیں جیسے تم نہ جڑیا گھر سے چھوٹ کر آ رہی ہوں!"

آپ نے اپنی اچھی تعریف کی ہے۔ حنا باجی! " نازی ہنس پڑی۔

خدا کی پناہ: اس نے گال تھام لئے اور بے موقع شعر عرض کر دیا۔

سا دل عجیب و غریب ہولناک خیالوں میں غرق تھے!۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" نازی نے اسے شرارت سے ٹھوکا دیا۔

"کل" وہ مرتعش آواز میں بولی "اس وقت۔ میں کتنی بدل جاؤں گی۔ نازی۔ اپنا گھر مجھے پرایا معلوم ہوگا۔ مہمانوں کی طرح آیا کروں گی۔ یہ رات جو مجھ پر گزرنے والی ہے۔ زندگی کے کیسے عجیب اور نامانوس تجربوں سے مجھے آگاہ کردے گی۔۔۔ تم نہیں جانتیں۔ اچھے برے تمام خیالوں نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔۔۔ میں عجیب ہوں۔۔۔ میں بھی پسند نہیں کرتی کہ کوئی انسان۔۔۔ چاہے وہ میرا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ جائز اور ناجائز طور پر بھی مجھے ہاتھ لگائے! اف خدا کی پناہ۔ کتنی شرم کی بات ہے۔"

"اوئی توبہ۔۔" نازی نے گلابی ہوکر اپنا چہرہ پھیر لیا۔ "ایسا بھی کیا سوچنا ہے سب کے خیالات تمہاری طرح ہوجائیں تو اللہ کی دنیا آگے نہ بڑھنے خدا کوئی صورت نکالے۔ مجھ پر کوئی افتاد نہ پڑے۔" شبانہ نے کہا۔

"اچھا سنو۔ میں تمہاری سسرال ہوکر آرہی ہوں۔" نازی نے بات بدل دی۔ "اللہ شبی۔ تم وہاں کیسے ہنگامے دیکھتیں۔ میں تو مبارز الدین صاحب سے بھی ملی تھی۔۔۔

ہٹو۔ جھوٹی۔۔۔" ہا

ان کی ایک بات خلش بن کر دل میں کسک پیدا کر رہی ہے" نازی نے کہا۔ "مجھے بڑھتے ہیں وہ۔ مجھ سے ایسا شدید تکلف بھی نہیں کرتے جب میں نے انہیں مبارکباد دی اور پوچھا کہ آپ کی مرضی کے مطابق دلھن مل رہی ہے نا۔ تو وہ بڑے برہم اور مکدر لہجے میں بولے کہ۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے پھانسی پر چڑھانے سے پہلے بھی تو مجرم کی ہر خواہش پوری کردی جاتی ہے

ریا کاری کرنا نہیں چاہتا۔ تم اگر چاہو تو اسی گھر میں رہ سکتی ہو۔ مگر میں تمہارے پاس نہیں رہوں گا۔ میرا انتظار اب مت کرنا!" احمد نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اور جب تک شبانہ اسے روکتی تھامتی وہ پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا۔ دروازہ اس کی پشت پر بند ہو گیا۔

شبانہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی یا یہ حقیقت تھی۔ وہ دوڑتی اور کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ دور کوئی دریا بہہ رہا تھا۔ درختوں میں ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ بارش کا شور مہیب تھا۔ وہ دوسری کھڑکی میں آئی۔ لب دریا ایستادہ سینٹ تھریسا کی بیمار زدہ روشنیاں پانی کی سطح پر کانپ رہی تھیں!۔

وہ لڑکھڑائی اور کھڑکی کے نیچے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

صبح چمکیلی تھی!۔ ہر طرف شادمانی کا دور دورہ تھا! بہت سے مہمان اب بھی ایسے تھے جو دولہا دلہن کے دیدار کے مشتاق تھے! خواتین ثریا بیگم کے پاس بیٹھی تھیں۔ ملازموں کی فوج ناشتہ کے انتظام میں دوڑتی پھر رہی تھی!۔

ایک خاتون دیوار گیر کلاک دیکھ کر ہنس پڑیں "اے باجی، بیگم۔ بس آپ اپنے صاحبزادے سے کہئے کہ بیدار ہوں۔ ایسی بھی کیا نیند ہے ایک نظر دلہن کو دن کے اجالے میں دیکھ کر پھر ہم بھی اپنے گھر جائیں!"

ثریا بیگم کے دل پر پتھر کی سِل رکھی تھیں۔ مجبوراً مسکرائیں اور اپنی عزیز کسی لڑکی سے کہا کہ وہ مبارز کو جگا دے۔ لڑکی ہنستی ہوئی بھاگی۔ خواتین سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

دو لمحوں بعد سکوت کی چیخ نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ دوڑتی

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟۔ کون سی قیامت آگئی ہے؟" سردار صاحب دالان میں کھڑے دہاڑ رہے تھے۔ "کہاں ہے وہ ناخلف۔ کس نے کہا کہ وہ چلا گیا۔؟ بکواس ہے سب۔ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ آپ سب لوگ بے وجہ شور نہ مچایئے!"

سناٹے میں صرف ثریا بیگم اور شبانہ کی سسکیاں گونجتی رہیں!

رات اندھیری اور بھیگی ہوئی تھی۔ بارش کا زور اب تک نہیں ٹوٹا تھا۔ سڑکیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ لیمپ پوسٹ کی دھندلی روشنی میں ایک قوی ہیکل سایہ شہر سے لمحہ بہ لمحہ دور بڑھ رہا تھا۔ اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ حواس مفلوج تھے اور اعصاب مسلوب۔ اپنے باپ کو صدمہ پہونچانے کی خاطر وہ گھر سے تو نکل آیا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا!۔

قہر و غضب کی آگ نے اس کا وجود خاکستر کر دیا تھا!۔ حتیٰ کہ اس کا یہ احساس بھی فنا ہو گیا تھا کہ وہ بہترین آرام و آسائش کی زندگی ترک کر کے جان بوجھ کر کانٹوں بھری راہ پر چلنے لگا ہے۔ وہ تو بس چلتا رہا۔ کوٹھی اس نے اپنے بہت پیچھے چھوڑ دی۔

اس کے جسم پر اب بھی عروسی لباس تھا!۔ شیروانی کیچڑ میں لت پت ہو چکی تھی جوتوں میں کیچڑ بھر گئی تھی۔ لیکن اسے اس کا ذرا احساس نہ تھا!۔

وہ تو یہ سوچ سوچ کر زہر آلود ہنسی ہنس رہا تھا کہ جب کوٹھی میں

صبح ہوگی تو کیا ہوگا؟۔

اچانک کہیں بجلی گری۔ اور وہ پل بھر کے لئے لرز کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ رکا نہیں۔ بادل کی ہولناک گرج میں اس کے قدموں کی آہٹیں بھی مدغم ہو گئیں۔ اس نے ایک سسکی لی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا چاہا کہ کہیں آس پاس کوئی مسجد کوئی مندر کوئی کھنڈر تو نہیں ہے۔ لیکن کہیں کسی پناہ کا پتہ نہ تھا۔ دوکانیں مکانات دروازے سب بند تھے!۔ اور بارش کی گرج بدستور تھی۔

بجلی پھر چمکی! اس نے ایک جگہ ٹھہر کر جسم سے چمٹی ہوئی شیروانی اتاری اور ایک طرف اچھال دی۔ جوتے اتار پھینکے جو ریلے میں بہہ نکلے۔ اب وہ ننگے پاؤں چل رہا تھا!۔ پانی اس کے ٹخنوں سے لگا ہوا بہہ رہا تھا! پھر وہ گھٹنوں تک آیا اور جب کمر تک پہنچا تو اسے پتہ چلا وہ بے خبری کے عالم میں کسی برساتی ندی یا نالے میں بہہ رہا تھا۔ پھر نالے سے آگاہ نہیں تھا!۔ اور اب تک حواس بھی ساتھ چھوڑ رہے تھے!۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ زمین آسمان میں پانی ہی پانی تھا۔ اس نے خود کو قسمت کے دھارے کے حوالے کر دیا۔ اپنی دانست میں ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے ایک بہاؤ کی آواز آئی اور مغموم جیسے وہ بے گنتی کی منزل سے آیا تھا۔ پھر اس کے گلے تک پانی آیا اور اسے کچھ خبر نہ لگی کہ پھر اس پر کیا گزری۔

وہ ساعتیں ہوش اور بے ہوشی کے درمیان عجیب سی گزریں۔ جب اس نے ڈوبتے ڈوبتے ہاتھ پاؤں چلائے۔ بے آواز کسی کو مدد کے لئے پکارا۔ کہیں کھو لینی چاہیں۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھے ہوئے تھے۔ کندھوں پر سر کی جگہ پتھر رکھا ہوا تھا!۔ جسم ڈوب رہا تھا!۔ جیسے بار بار

کوئی بدن کے مختلف حصوں پر انگارے رکھتا اٹھاتا ہو۔

پھر اس کے کانوں میں مبہم سی آوازیں پہونچیں۔ یہ لہروں کا بے پناہ شور نہ تھا!۔ انسانی آوازیں تھیں۔ اس نے اپنے جسم پر ہاتھوں کا مس محسوس کیا۔ مگر وہ اب بھی زبان نہ ہلا سکا!۔ اور پھر غافل ہوگیا!۔

وہ ایک شکستہ و ندریدہ مکان میں پھوس کے بستر پر پڑا ہوا تھا! تیمار داروں میں ایک معمر مرد تھا اور ایک لڑکی۔ بوڑھا اس کا جسم سینک رہا تھا!۔ لڑکی اپنی انگلیوں سے اس کے سر میں کنگھی کر رہی تھی!۔

معلوم نہیں بے چارے پر کیا افتاد پڑی ہے!۔ بوڑھے نے کہا۔ اور پھر اس کی نبض تھام لی۔ اس کے پژمردہ لبوں پر طمانیت انگیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ سانس ٹھیک چل رہی ہے!۔ ہو سکتا ہے کہ جلدی ہوش بھی آجائے۔"

بابا آخر یہ آدمی کون ہے؟۔ لڑکی نے سوچا۔ "صورت شکل سے شریف اور اعلیٰ خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ بابا آپ بھیا کو دیکھنے گھاٹ پر نہ جاتے تو شاید یہ بیچارے کبھی زندہ و سلامت کنارے پر نہ آ سکتے!۔ میں تو پہلی نظر میں انہیں زندہ نہیں سمجھی تھی!۔"

پھر وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس بے ہوش آدمی کو دیکھنے لگی۔

نشی۔ گرم دودھ تو تیار ہے نہ بیٹی؟۔ بوڑھے نے پوچھا۔

ہاں بابا!۔ پتیلی انگیٹھی پر رکھ دی ہے۔" نشاط نے کہا۔ "دیکھئے ان کی پلکیں جھپک رہی ہیں۔ بابا پاس آکر آوازیں دیجئے۔ شاید ہوش آجائے!۔"

بابا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔ اس نے دو لمحوں بعد آنکھیں کھول دیں۔ نشاط خوش ہو گئی۔ بوڑھے کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بیٹے۔ ہوش میں آؤ۔" بوڑھے نے کہا۔ "کیا میں تمھیں سہارا دے کر
اٹھاؤں؟"

اس نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ بوسیدہ مکان۔ تاریک دیواریں
جھکی ہوئی چھت اور تعجب ہوا۔ "پانی مجھے کہاں بہا دیا؟"

"پریشان نہ ہو۔" بوڑھے نے اس کا سر سہلا کر بولا۔ "تم ہمدردوں میں ہو۔
اب کیسی طبیعت ہے؟" پھر اس نے لڑکی سے گرم دودھ لانے کا اشارہ دیا
وہ کٹورہ بھر دودھ لے آئی۔ بوڑھا بدستور مسکرا رہا تھا۔ جھک کر بولا
"اٹھو میاں۔ پی لو۔" اور سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نتاشا نے کٹورہ بڑھا دیا۔ وہ بڑی بیٹھی اور تیز
نظروں سے اپنے مصیبت زدہ مہمان کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ منھ سے کچھ نہ
بولی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی حسین دوشیزہ تھی۔ اس کے حسن میں چار
چاند لگانے والے اس کے سیاہ چمکیلے اور بڑے لمبے بال تھے۔ جو کمر تک
پیچھے لہرا رہے تھے۔ شفاف رنگت۔ سیاہ آنکھیں۔ پیشانی سے حیا و
عصمت کا نور جھلک رہا تھا۔

بہادر کے بدن میں توانائی آنے لگی۔ حواس واپس آئے اور اپنے ساتھ
تلخ و ترش یادوں کے کارواں بھی لائے۔ پھر اس کے دل میں درد ہونے لگا
بچھڑے ساتھی ستانے لگا۔ اور چہرے پر حزن و ملال کے سائے بکھر گئے۔
"اب تم آرام کرو۔" بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "صبح کے چار بجنے والے ہیں۔ تم
ایک دن اور دو راتیں مسلسل بے ہوش پڑے رہے۔ اللہ کا شکر ہے جس
نے تمھیں نئی زندگی بخشی۔ صبح کو میں تمھاری کہانی سنوں گا۔ بیٹی نتاشا تم
دیکھا کرو۔ اور میں بھی اب بزدل دو خدا ان کے حال پر رحم کرے۔"

اس نے بڑی محبت سے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔ اور نشاط نے ایک گرم کمبل اس کے گلے تک اڑھا کر بڑا رخ دیتا کر دیا۔ پھر دونوں باپ بیٹی اسے آرام سے سو جانے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔

اسے معلوم نہیں تھا وہ کہاں تھا۔ کس کا مہمان تھا۔ کس طرح یہاں پہونچا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا۔ اللہ کے اپنے تخلیق کئے ہوئے انسانوں میں تھا!۔ درندوں میں نہیں۔ سوچتے سوچتے وہ بے خبر سو گیا!۔

صبح کو وہ از سر نو اپنے میں طاقت محسوس کر رہا تھا!۔ بوڑھے نے بڑی شفقت سے مسکرا کر اسے صبح بخیر کہا۔ اس کی دانست میں انسانیت کا افضل ترین معیار سلام اور محبت کا برتاؤ تھا!۔ نشاط اسی کمرے میں دستر خوان بچھا کر اس پر مکئی کی روٹیاں۔ گائے کا دودھ۔ ترکاری اور چٹنی سجا رہی تھی اب بھی وہ پھول کی طرح شگفتہ نظر آ رہی تھی!۔

بوڑھے نے اس کے ہاتھ دھلانے کے لئے لوٹا اٹھایا۔ اور مسکرا کر بولا: آیئے ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے" مبارز نے شرمندہ ہو کر اس کے ہاتھ سے لوٹا لے لیا۔

ناشتے پر میزبان نے اس کی کہانی سننے پر اصرار کیا۔ مبارز کے پاس کہنے کے لئے جو کچھ تھا۔ وہ بوڑھے کے لئے لغو اور مہمل تھا۔ تھوڑی اس سے بنا نہیں پڑ رہا تھا۔ کیا کہتا۔ اس نے الٹا سوال کیا۔

یہ کون سی بستی ہے جناب...... میں کہاں آ نکلا ہوں۔

وہ دیکھو۔ دریا کے کنارے سے کیا ت کا دفتر ہے۔ بوڑھے نے کہا: میں ماہی گیروں کا انچارج ہوں۔ برسوں سے یہیں رہتا آیا ہوں۔ شہر سے یہ مقام بڑی دور ہے۔ یہاں تو لوگ تفریحاً مچھلی کا شکار کھیلنے آتے ہیں۔ شاید تم کبھی ان گرد دنواح میں نہیں آئے۔

"جی نہیں۔ بس پہلی بار بہتا ہوا آیا ہوں!"

بوڑھا ہنسنے لگا: "شکار کرنے آئے ہوگے؟"۔

"جی ہاں!" مبارز کو بہانہ مل گیا۔ "یہی بات تھی۔ میرے ساتھ اور بھی دوست تھے۔ واپسی میں دیر لگی۔ بارش نے بھی آلیا۔ کشتی میرے پاس تھی۔ مگر نجانے کیسے وہ الٹ گئی اور میں دریا میں گر پڑا۔ لیکن آپ نے مجھے کیسے بچایا"

"اللہ نے میرے بچے۔ اللہ نے!" انھوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "نشاط کا بھائی اس رات دیر تک گھر نہیں آیا تھا! اس کی تلاش میں ساحل پر گیا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت بہہ گیا ہوا ہے — مچھیروں نے نشاندہی کی کہ ان کی کشتی تمہارے جسم سے اٹک کر رک گئی تھی وہ خدانخواستہ تمہیں کسی ماہی گیر کی لاش سمجھ کر جھونپڑے میں اٹھا لائے تھے۔"

"بابا۔ چائے لیجیے!" نشاط کی مترنم آواز پر مبارز کی آنکھیں ادھر اٹھ گئیں۔ صبح کی نکھری روشنی میں وہ کھلے ہوئے گلاب کی سی تروتازہ معلوم ہو رہی تھی! پہلی بار اس کے ذہن میں رخشی اور شبانہ کے مجموعے نقوش سے چہرے ابھرے اور غائب ہوگئے! نشاط بھی اس کی وارفتہ نگاہی سے محجوب ہو گئی۔

"تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔ بیٹا۔ نہ پوچھو قلب پر کیا گزرتی ہے جب کوئی کسی سے جدا ہوتا ہے!" بوڑھے نے فلسفیانہ تبصرہ کیا۔

"نہیں بابا" بے اختیار مبارز کے ہونٹوں سے نکلا۔ "میں اکیلا آدمی ہوں گھربار اپنا پرایا میرا کوئی نہیں!"

بوڑھا حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "افسوس۔ افسوس۔ یہ عمر اور یہ تنہائی خدا کی مرضی۔ بیٹا کوئی امر مانع نہ ہو تو۔ میرے ہی پاس رہو۔ میں غریب ہوں

محنت کرتا ہوں۔ لیکن تمھارے لیے میں کوئی دقیقہ آرام کا اٹھا نہ رکھوں گا!
"خدمت تو مجھے آپ کی کرنی چاہیئے بابا.. لیکن مجھے افسوس ہے۔ میں
اس شہر کے جوار میں بھی رہنا نہیں چاہتا۔!"
"پہلے تم کیا کرتے تھے؟"
سردار افتخار الدولہ کے اکلوتے صاحبزادے۔ کالج کے معزز پروفیسر کو
اس سوال نے پھر دم بخود کر دیا۔
محنت!" بوڑھے نے کہا۔" دولت نہ آسمان سے برستی ہے۔ نہ زمین
سے اگلتی ہے۔ وہ تو بازوؤں کے کس بل سے جھڑتی ہے.. میاں اگر منظور
کرو تو میں اپنی جگہ تمھیں دلا دوں۔ میں اب بوڑھا اور کمزور ہو رہا ہوں۔
سوا سو روپیہ ماہوار مجھے ملتے ہیں۔ وہ تمھیں ملا کریں گے!" مبارز کی آنکھوں
میں آنسو تیرنے لگے۔ ابھی دنیا سے خلوص اٹھ نہیں گیا۔
"بابا میں نے عرض کیا تھا۔ اب اس قرب و جوار سے دل بھر گیا۔ میں کسی
دوسری سمت جاؤں گا۔ آپ کو اور بہن نشاط کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ بابا۔
میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میں کبھی نہ کبھی آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔ بابا۔
میں آپ کو خط لکھوں گا۔"
"اچھا بیٹے اچھا۔ مگر مجھے دکھ ضرور ہو گا۔ تمھارے قیام سے امارت
برس رہی ہے۔ تمھارے بے داغ اور خوبصورت ہاتھ کہہ رہے ہیں کہ وہ
محنت اور جفاکشی کے عادی نہیں۔ وہ صرف قلم پکڑنا جانتے ہیں۔ معلوم
نہیں۔ تم کہاں جاؤ گے۔ کدھر مارے مارے پھرو گے۔ خیر۔ اللہ سب کے
سروں پر ہے۔ ہاں بیٹا مجھ سے ضرور ملنا۔ خدا تمھارا حافظ و ناصر ہے۔!"
مبارز اس کی قیافہ شناسی کا معترف تھا! وہ خوفزدہ بھی تھا۔ کہیں وہ اور

طہارت کا ثبوت نہ دینے لگیں۔ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

بڑے میاں نے کچھ سنے بغیر کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"بابا۔ مگر۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم مجھے بابا کہہ رہے ہو۔ کیا اب بھی کوئی غیرت باقی رہ گئی ہے۔ تم سفر کرو گے۔ تمہیں بھوک لگے گی۔ بیٹا۔ دنیا میں مادی وسائل تو لگے ہی رہتے ہیں!۔ اچھا خدا حافظ۔"

شاہدہ اسے ساحل تک چھوڑنے آئی۔ چمکیلی صبح میں وہ اتنی حسین لگ رہی تھی۔ جیسے آفتاب کی کرن ہو۔ اس کے ڈھیر بھر بال شانوں اور پیٹھ پر لہرا رہے تھے! ہونٹوں پر مکوتی مسکراہٹ تھی۔

کھیتوں کے پاس وہ جدا ہوئے۔ شاہدہ نے اس کی طرف ایک چھوٹی سی پوٹلی بڑھا دی۔ اور سر جھکا کر بولی "دو تین روٹیاں اور اچار ہے۔ راستے میں آپ کو بھوک لگے گی۔" مسافر کے ہونٹ بھنچ گئے۔ "میری بہن۔ کیا کچھ خدا نے تم دونوں کو دے رکھا ہے۔ جو اوروں کو نہیں دیا۔ میں تم دونوں کی محبت کو سلام کرتا ہوں۔"

"کبھی نہ کبھی آئیے گا ضرور۔ بھیا!" شاہدہ نے کہا۔ اور پیچھے ہٹ کر درختوں میں اوجھل ہو گئی!۔

کھیتوں سے تھوڑی دور سے لانچ تھی۔ اور کچھ ہٹ کر چھوٹا سا اسٹیشن بھی تھا! اسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ٹرین خدا جانے کدھر سے آئی اور خدا جانے پل بھر ٹھہر کر کہاں چلی گئی!۔

اس کے کمپارٹمنٹ میں تین چار آدمی اور بھی تھے۔ بڑے بڑے صافے باندھے۔ صورتوں سے بدمعاش اور جسموں سے پہلوان لگ رہے تھے!۔

بادشاہو۔ کہاں کے ارادے ہیں ؟ ایک نے مبارز سے پوچھا۔ دوسرے بھی اسے دیکھنے لگے ! ۔

"مسافر ہوں ۔ بھائی صاحب ۔ تقدیر جہاں کہیں لے جائے !" مبارز نے کہا ۔ اتنے میں ٹکٹ چیکر آ گیا ۔ ٹکٹ اس کے پاس کہاں تھا ! اسے دو گنا جرمانہ بھرتے ہوئے ان لوگوں نے بھی دیکھا ۔ مبارز باقی رقم جیب میں رکھنے لگا ۔ ٹی ٹی کے نکلتے ہی وہ اس کے ارد گرد آ بیٹھے ۔ وہ اب بھی نہیں سمجھا ! ان کا مقصد کیا تھا ۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی ۔ اس کا خدشہ بھی نہیں تھا کہ کوئی اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں آ جائے گا ۔ وہ کل چار تھے ۔ مبارز تنہا ۔ اسے بڑے سکون سے لوٹا گیا ۔

تقدیر کی یہ بھی ستم ظریفی تھی ۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی ! ۔ ٹرین ایک گھنے جنگل سے گذر رہی تھی ۔ وہ چاروں چلتی ریل سے اتر گئے ! ۔

اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی ! ۔ ایک جنکشن پر ٹرین رکی ۔ اور وہ اتر کر پرلے جنگل سے باہر نکل گیا ۔ ۔ ۔ حالات سے شکست اسے اب بھی قبول نہ تھی ۔ اب تو اسے اپنی تقدیر پر غصہ آ رہا تھا ! ۔ اس نے خود کو بے رحم دنیا کے حوالے کر دیا ۔ اپنے بچاؤ کا ارادہ کئے بغیر ۔

مسلسل تین دن کی تگ و دو کے بعد وہ ایک بارونق شہر میں پہنچا ۔ لیکن اس میں مزید قدم اٹھانے کی سکت نہیں تھی ! ۔ شام ڈھل رہی تھی ۔ درختوں میں چڑیوں کا شور بے پناہ ہو چلا تھا ! ۔ ایک بڑی عمارت کی دیوار سے وہ سہارا لینے کے لئے بیٹھا اور نقاہت کے مارے اس پر غشی طاری ہو گئی ۔

اگر کوئی اس کا شناسا اسے اس عالم میں دیکھتا تو ہرگز نہ پہچان سکتا کہ وہ کبھی دولت مند خاندان کا معزز فرد بڑی درسگاہ کا معلم تھا ۔

اس کا لباس ناصاف اور پرشکن تھا۔ بال جھنڈا کی طرح بکھرے ہوئے داڑھی بڑھی ہوئی۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اور بخار کی تکلیف نے ہوش سے بیگانہ کر دیا تھا!۔

کچھ لوگوں نے ایک شکستہ حال آدمی کو سرِ راہ بیٹھے دیکھا مگر وہ پاس سے نکلے چلے گئے۔

"اللہ... ایک گھونٹ پانی۔" وہ کراہ رہا تھا!۔

اُف۔ بےچارہ۔! کسی نے کہا۔ دو تین آدمی اس کے قریب آئے۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے پانی کا اشارہ کیا۔ پھر دیوار سے سر ٹیک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا

۔ سامنے کیفے سے لپک کر پانی لے آؤ۔ کسی مرد نے کہا۔ چند ثانیے بعد اس کے لبوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لگا دیا گیا۔ لیکن پانی پینے سے پہلے ہی اس پر پھر غشی طاری ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے محسوس کیا کہ اب وہ سڑک کے کنارے نہیں تھا۔ مگر کہاں تھا۔ یہ وہ اندازہ نہ لگا سکا!۔

اس نے ہانپتی ہوئی سانسوں میں کہا۔ پانی۔ پانی۔

قریب قریب ایک سو چھڑا۔ کسی کی بھاری آواز اس کے شعور سے ٹکرائی۔ کوئی اس کی کلائی تھامے کھڑا تھا۔ پھر کسی نے اس کے ہونٹوں میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکا دیا۔

بہت سی ملی جلی آوازیں اس کے ذہن میں بھن بھنا رہی تھیں۔ جن کا تجزیہ دشوار تھا!۔

اگر ہوش آ جائے تو شاید بچ جائے!۔

کون صاحب ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں؟"

معلوم نہیں؛ سڑک کے کنارے بے ہوش پڑے تھے۔ جرار میاں لے آئے۔ کچھ بھی ہو ڈاکٹر۔ ہیں یہ اچھے اور معزز گھرانے کے فرد لگتے ہیں۔ چہرے پر شرافت اور وقار کے آثار ہیں۔"

"ایک سو چھ۔ پوائینٹ دو۔ اللہ رحم کرے۔"

"اپنی سی پوری کوششیں کیجئے ڈاکٹر صاحب۔ بعد کو جو خدا کی مرضی ہو۔!"

اس نے اپنے بازو میں انجکشن کی خفیف سی تکلیف محسوس کی۔ اس کا سارا وجود پھنکا جا رہا تھا۔ ہزار چاہنے پر بھی وہ آنکھ نہ کھول سکا۔

"بھائی جان... اب کیا تکلیف ہے؟" ایک نرم و نازک آواز کمرے میں گونجی۔

"تدبیر کر رہے ہیں۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے!"

مسٹر جرار۔ آپ نے محسوس کیا۔ بخار کی حدت کم ہو رہی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب۔ براہ مہربانی۔ دوسرا انجکشن پھر دیجئے۔!"

"کاش بچ جائے۔!"

اب کوئی خطرہ نہیں۔ بخار اگر اسی رفتار سے بڑھتا جاتا تو بے شک حالات قابو سے باہر ہوتے۔ مگر اب تپش میں کمی ہو رہی ہے۔ شام تک بالکل اتر جائے گا!"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں... بیٹی۔ تم جا کے سو جاؤ!"

ڈاکٹر امید بندھا کر چلا گیا۔ کمرے میں ایک دو آدمی رہ گئے۔ ایک معمر دوسرا نوجوان۔

معمر آدمی نے آگے بڑھ کر اس کی پسینہ ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھا! مسافر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور گلوگرفتہ آواز میں کہا۔ پانی۔ پانی۔

نوجوان نے جھک کر نیند نگ کپ اس کے لبوں سے لگا دی۔

جب اسے کئی دن بعد مکمل طور پر ہوش آیا تو اس نے ہیجانی انداز میں اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ بڑا صاف روشن اور ہوا دار کمرہ تھا! سامنے خوبصورت کھڑکی سے نیلگوں آسمان دکھائی دے رہا تھا!۔ کھڑکی میں کرسٹل کا ایک چمکیلا گلدان رکھا تھا جس میں بڑے بڑے سرخ و سفید گلاب مسکرا رہے تھے!۔ ایک اونچی میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ سر پر سیلنگ فین بہت آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے!۔

اب وہ کہنیوں کے سہارے مسہری پر اٹھ بیٹھا۔

اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں شل اور بوجھل تھے آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھا کہ کچھ سوچ سکتا!۔

"اب آپ کیسے ہیں؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ایک سن رسیدہ شخص اس کے پاس کھڑا تھا۔ اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر انھوں نے کسی کو آواز دے کر کہا۔ "ارشد کو یہاں بھیج دو۔!"

دوسرے لمحے ایک خوش رو اور متبسم نوجوان کمرے میں آیا۔ اور پرانے دوستوں کی طرح ہنس کر کہا۔ "ہیلو!"

وہ اب بھی پاگلوں کی طرح گھور رہا تھا۔ یہ دونوں کون تھے۔ وہ کہاں تھا؟۔

"پورے دو ہفتوں کی جانکاہ بیماری کے بعد آپ کو ہوش آیا ہے۔" نوجوان اس کے پاس ہی ٹک گیا۔ بڑے میاں نے الگ آرام کرسی سنبھال لی۔

"کچھ سوچنے کی زحمت نہ کیجئے۔" اس نے کہا۔ "اب تو سب ٹھیک ہے۔"

"کیا آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟"۔

سچے بندھن

"یہ کون سا مقام ہے۔" مبارز نے پپڑی پڑے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"حیدرآباد۔"

"خدا کی پناہ!"

"کیوں۔ کیوں۔"

"میں بڑی دور پہنچ گیا۔ مظفر نگر سے چلا تھا!۔ راستے میں لوگوں نے لوٹ لیا۔"

"پھر واپس چلے جایئے گا۔ اس میں اتنی فکر کی کیا بات ہے؟ آپ اپنے گھر کا پتہ بتایئے میں ابھی چٹی کر دیے دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ سنیئے!" اس نے سر تھام لیا۔

"خیر آپ فکر و تشویش کا زیادہ بار اپنے ذہن پر مت ڈالیئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا!" انھوں نے کہا۔

"آپ کچھ پیش گئے۔!" پھر کنوں نے کسی جواب کا انتظار نہیں کیا۔ تالی بجا کر ملازم کو بلایا اور اسے تفصیلی ناشتہ کا آرڈر دے کر مبارز کی طرف مڑے۔

"مجھے جرار کہتے ہیں۔ آرٹس کالج میں پڑھاتا ہوں۔ آپ میرے والد محترم... زینت اندر ہے۔ میری چھوٹی بہن۔ وہ بھی بہت پریشان تھی۔"

مبارز اپنا دوسرا نام سوچنے لگا۔ اتنے میں ملازم ٹرالی ڈھکیلتا ہوا آیا اس کے پیچھے کوئی اور تھا۔ سفید ریشمی لباس میں ملبوس۔ نازک نازک سا جسم شرمیلا سا چہرہ۔ جرار نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ "لو بھئی۔ مبارک ہو۔ تم اپنے اجنبی بیمار کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔"

مبارز نے لڑکی کو اپنی طرف دیکھتے پاکر نظریں جھکا لیں۔

"بھائی جان۔ کافی بناؤں۔ یا چائے؟"

"کیوں۔ میاں!" بڑے حضرت نے اس سے پوچھا۔

"جی؟... وہ بڑی مشکل سے مسکرا سکا! "آپ کی جیسی مرضی جناب!"

جرار نے قہقہہ لگایا۔ "تکلف برطرف۔ اپنا گھر سمجھئے۔ آپ کو خبر نہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ٹھیٹ ریگزار عرب سے آئے تھے۔ مہمان نوازی ہماری گھٹی میں پڑی ہے۔ آپ کی یہ قیل و قال ایک نہ چلے گی... جو کچھ کھانا پینا ہو بے جھجک کہہ دیجئے۔ میں بھی کرتا ہوں۔ اور پھر تو آپ شدید بیماری سے اٹھے ہیں۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ جرار صاحب" اس نے کہا "آپ نے مجھے پناہ دی ہے۔ دیکھ بھال کی اور ڈیڑھ ہفتوں تک نہ صرف میرا علاج کروایا بلکہ تیمارداری بھی کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کن الفاظ۔۔!"

انھوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور کافی کی پیالی اسے تھما کر خود ہنسنے لگے۔

"انسان اگر انسان کے کام نہ آئے تو اسے انسان کون کہے گا۔" انھوں نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور بادام کی پیسٹ مبارز کی گود میں رکھتے ہوئے بولے "کھائیے۔ تکلف نہ کیجئے۔ بلکہ مجھے تو بہت افسوس ہو رہا تھا۔ دیکھ نہیں سکتا۔ آپ کالج کی دیوار کے سائے میں بے ہوش پڑے تھے۔ میں لائبریری میں بیٹھا پیپر دیکھ رہا تھا۔ تیند طالب علموں نے آکر مجھے خبر دی۔ آپ کے بشرے جثے سے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کوئی ایسے ویسے راہرو نہیں۔ ضرور کوئی نہ کوئی افتاد پڑی ہے آپ پر... بخار میں آپ جل رہے تھے ایسی حالت میں اگر میں انسانیت کا فرض نہ نبھاتا تو اور کیا کرتا۔"

"بھائی جان [illegible] تو لیجئے۔" زینت نے کہا۔ جرار نے ایک اور طشتری۔

اس کی طرف بڑھا دی۔

"ہم کو بڑی خوشی ہے کہ ہم نے اپنی کوششوں سے آپ کو بچا لیا۔ خدا نے رحم کیا:" بڑے حضرت نے کہا۔ پھر اچانک بول پڑے۔ "آپ کے بیوی بچے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"خیر کچھ پرواہ نہیں۔ میرے بھی نہیں ہیں!" جرار نے اس لہجے میں جلدی سے کہا کہ مبارز کو ہنسی آ گئی۔ بڑے میاں اٹھ کھڑے ہوئے مبارز نے جلدی سے کہا۔

"جناب،۔ اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کتنی زحمت اور تکلیف میری وجہ سے آپ سب کو ہوئی ہے۔ میں پھر آپ سب کا شکریہ۔!"

"گھر جائیے گا؟...!" جرار نے پوچھا۔

"گھر؟... کس کا گھر... میں تو کہیں اور جاؤں گا... میرا کوئی گھر بار نہیں جرار صاحب!" اور یہ کہتے کہتے پچھلی تمام ناخوشگوار یادوں نے اس کے ذہن پر یلغار کر دی۔

"کیا آپ خدانخواستہ۔ اکیلے ہیں دنیا میں۔؟" جرار نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں... یہی سمجھئے۔!"

"تو پھر غریب خانہ ہی کیا برا ہے" جرار نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر کہا۔ "جب تک مزید طاقت نہ آ جائے۔ یہیں رہئے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا یہ خانہ بے تکلف ہے... مگر آپ کو کیا کہہ کر پکارا جائے۔ جناب!"

"مم۔ مجھے ریحان کہتے ہیں" مبارز نے کہا۔ وہ بے حد سنجیدہ مغموم

اور اداس ہو رہا تھا۔ جیسے بالکل بدل گیا ہو۔ خود کو بھول گیا ہو۔

بڑے میاں اپنے کام سے چلے گئے۔ زینت کبھی برتن سمیٹ کر چلی گئی بزرگ دیر تک اس سے بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ مبارز چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے کھسک کر گھر کی راہ لے لیکن بزرگ نے کسی طرح منظور نہیں کیا۔

"میرا چھوٹا بھائی آپ سے بہت مشابہ تھا۔ وہ حال ہی میں ڈیوٹی کے دوران اچانک خون کا دباؤ بڑھ جانے سے ختم ہو گیا۔ کیا حرج ہے اگر آپ خود کو میرے چھوٹے بھائی کی جگہ سمجھیں! کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی۔ بیٹے صاحب۔ کہ خدا نے آپ کو یہاں بھیجا ہے۔"

"مگر—!"

"یہاں میں آپ کی ملازمت کا بھی بندوبست کر دوں گا۔ پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

"آپ کا تو لیگ تھا:"

"نہیں؟"

"جی ہاں!"

"تو پھر کیا پرواہ ہے۔ مزے کرنا۔ میں شام کو پھر آؤں گا۔ فی الحال مجھے دیر ہو گئی ہے۔ نہاؤ دھوؤ۔ میرے کمرے میں تمہیں ضروریات کا سارا سامان مل جائے گا۔ کوئی دشواری ہو تو زینت کو آواز دے لینا۔ اچھا خدا حافظ!"

وہ چل دیے اور مبارز پھر سوچتا رہ گیا۔ کیا ہو رہا ہے؟ گھر میں اس وقت۔ مگر اب تو بہت دن بیت گئے! ابا جان امی اور شہناز صبر کر کے بیٹھ گئے ہوں گے۔ ممکن ہے تلاش بھی کی ہو۔ لیکن تو کہاں سے کہاں پہنچا ہے۔

"وقت گذرتا رہا۔ وہ بیٹھا سوچتا رہا۔!"

توصیف الرحمان صاحب کے قہر و غضب کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اپنے داماد کو تلاش کرنے سے پہلے انھوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ سردار افتخار الدولہ کے بخیے ادھیڑ دیں۔ انھوں نے اپنے چاروں لڑکوں اور دامادوں سمیت سردار صاحب پر دھاوا بول دیا۔

سردار صاحب کا خیال تھا کہ وہ کہیں روپوش نہیں ہوا۔ گھومنے گیا ہے۔ چلا آئے گا لیکن شبانہ کے بیان سے ثابت ہوا کہ وہ واپس آنے کے لئے نہیں گیا۔

"آپ یہ بتائیے کہ میری بچی کا کیا ہوگا؟" توصیف صاحب چنگھاڑ رہے تھے "آپ کے صاحب زادے کو بھاگنا تھا تو شادی سے پہلے بھاگتے!۔ یہ کیسا مذاق انھوں نے سب سے کیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں۔ یہ آپ کی سازش ہے۔ افتخار صاحب۔ مبارز الدین کو ڈھونڈنا ہی پڑے گا ورنہ میں آپ کی زندگی حرام کر دونگا"

سردار صاحب کی طرف ان کا اپنا کون تھا جو پشت پناہی کرتا۔ وہ تو بیٹے کو رو رہے تھے!۔ توصیف صاحب کی طرف پورا قبیلہ تھا

"آپ جانتے ہیں۔ پولیس میں اطلاع دی ہے۔ اپنے گماشتوں کو دوڑایا ہے۔ خود دن رات مارا مارا پھر رہا ہوں۔" سردار صاحب آنکھیں نکال کر بولے "سازش وازش کی بات نہ کیجئے گا۔ کون ایسا کمبخت باپ ہے جو بیٹے کو کہیں روپوش کرے گا۔ آپ کی تو بیٹی بہرحال آپکی رہے گی۔ مگر اندر چل کر مبارز کی ماں کی حالت دیکھئے۔ وہ ماہی بے آب ہیں۔ رونے پیٹنے کا انھیں ہوش نہیں

تھا... بکھرے ہوئے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے! مبہوت اور دم بخود
سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا [illegible] تھا کہ اس کے شوہر نے اسے
ناپسندیدہ قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ وہ روتے روتے تھک گئی تھی۔

ثریا بیگم ماں تھیں۔ دیوانوں سے بدتر۔ تین دن کا فاقہ ان پر گزر رہا تھا! اب
تو نیم بے ہوشی میں سسکتی رہتی تھیں۔ لبوں پر بیٹے کا نام تھا، رہ رہ کر دروازے
کی طرف دوڑ جاتیں۔

مجھے چھوڑ کر کہاں جائے گا۔ وہ سب کی طرف دیکھ کر رحم طلب اور تصدیقی
انداز میں کہتیں۔ جب وہ پانچ سال کا تھا، اور وہ کہنے لگتیں: شمّا تم نے...
بالکل نہ مارا تھا۔ ایک بار کھیلتے کھیلتے ہمسائے کے یہاں سو رہا۔ پھر جب...
دیکھا اس قدر ڈرتے ڈرتے گھر آیا [illegible] امی خفا ہوں گی۔

"ان کے آنسو بہنے لگتے۔ میں اس سے کبھی خفا نہیں ہوئی۔ پھول کی چھڑی نہیں
لگائی اسے مارنے کو۔ وہ بہت نیک اور پیارا بچہ ہے۔ کیسا کلیجہ مسوس رہا ہے...!
دروازہ کھلے اور وہ چلا آئے۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔ بھوکا پیاسا۔ کوئی افتاد
تو اس پر نہیں پڑی۔ میرے اللہ۔ کوئی تو مجھ سے آ کر کہہ دے۔ میرا رومی آ رہا
اور پھر آنچل سے چہرہ ڈھانپ کر زار و قطار رونے لگتیں۔

خالہ امی۔ یوں حواس کھونے سے تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی
شمیم نے سمجھایا: خدا کے لئے حوصلہ رکھئے۔ رومی بھائی چھوٹے سے بچے نہیں ہیں
اپنی مرضی سے گئے ہیں، جب چاہیں آ جائیں گے!

شبانہ کے پاس امی کی بہن اور بھاوجیں بیٹھی تھیں۔ اس غیر متوقع افتاد پر تعجب...
اور حیرت [illegible] مگر شبانہ کو ایک [illegible]
چپ لگی تھی۔

اب یہ دیکھو۔" وہ زیادہ جھلا گئے "چوری سینہ زوری۔ مجھ پر تو بالکل اثر نہیں ہوا۔ کندۂ ناتراش۔ ناشرفی۔ ناخلف۔ اب کھائے گا زمانے کی ٹھوکریں۔ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ خوب سبق سیکھے گا . . روپیہ۔ عیش و آرام اسے گراں گزرتا تھا! —"

"ابا جان۔ بس کیجئے!" شبانہ یکبارگی چلا اٹھی۔ "انھیں کوسئے بددعائیں دیجئے۔ وہ میرے بھی کوئی تھے!"

"شبانہ!!" "یہ سب اس کے بھائی صاحب نے آگ لگائی!" وہ مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"چلی جاؤ۔ شبی!" رعنا نے کہا "ابھی وہ بھی غضب ناک ہیں۔ بات بننے کے بجائے بگڑ جائے گی۔ پھر موقع محل دیکھ کر واپس آجانا۔"

شبانہ با دل ناخواستہ اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد لڑکیاں بھی رخصت ہو گئیں۔ مہمان بیویاں تو سرگوشیاں اور بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں کرتی پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ذرا سی دیر بعد ہی گھر میں ہو کا عالم طاری ہو گیا۔ سناٹا۔ سوگ۔ ویرانی۔ وحشت! حتیٰ کہ سردار صاحب کا دل الٹنے لگا۔

"یہ کیا ہو گیا —؟" وہ سوچنے لگے "اس نے اپنی ضد پوری کی۔ اگر آج یہ واقعہ رابعہ کی شادی کے ساتھ پیش آتا تو وہ یوں کبھی مجھ پر چڑھ نہ دوڑتے۔ میرے غم میں برابر کے شریک ہوتے۔ میں نے رابعہ کے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ خدا کی پناہ کیا اسی کا صبر پڑا ہے —"

انھوں نے مڑ کر ثریا بیگم کو دیکھا۔ وہ دیوانوں کی طرح جاگ رہی تھیں۔ تباہ حال۔ پریشان۔ مضطرب۔ لمحہ بہ لمحہ ان کا کرب ترقی پر تھا! — وہ رہ رہ کر چونک اٹھتیں اور دروازے کی طرف دیکھنے لگتیں۔ — پر سردار صاحب کو ان پر ترس آنے کی بجائے

کے پاس جا بیٹھے اور ادھر ادھر دیکھ کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں سمجھایا۔

"بیگم وہ تو چلا ہی آئے گا۔ مگر کیا تم خود کو اس قابل بھی نہ رکھو گی کہ اس کا استقبال کر سکو۔ دل مضبوط کرو۔ حوصلہ رکھو۔ یہ تمھاری بے قراری اور بے تابی کیا اسے واپس لائے گی؟"

انسان کی فطرت ہے۔ جس سے دلاسے کی امید نہ ہو۔ اس کی تسلی بہت سے زخموں کو کھرچ دیتی ہے۔ آنسوؤں کے دھارے ثریا بیگم کی ضعیف اور دھندلی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ دیر تک روتی رہیں۔ پھر روٹھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"آپ نے چھین لیا میرے لال کو مجھ سے۔ اس کی ایک چھوٹی سی آرزو پوری نہیں کی۔ آپ کیسے باپ تھے۔ اپنے بیٹے کی تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ ہائے ہائے۔ کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ جب خیال آتا ہے وہ اس گھر میں میرے پاس نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔ کیا گزر رہی ہے اس پر۔ بتائیے۔ اب کون ننھے بچے کی طرح مجھے امی کہہ کر پکارے گا؟" اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں!۔

مرزا صاحب جو بہت سخت گیر اور تند مزاج مشہور تھے مگر اب تو وہ بھی ضبط نہ کر سکے۔ انھوں نے بیوی کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ اور ان تین دن میں پہلی بار چپکے چپکے رونے لگے!۔ انھوں نے اپنی بھاری سسکیاں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ پھر جب زیادہ بے قرار ہوئے تو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ثریا بیگم تنہا بیٹھی تھیں۔

ان کی منھ چڑھی ملازمہ رحیمن تھی۔ اس نے منا سمجھا کر کچھ کھلایا پلایا تسلیاں دیتی رہی لیکن ثریا بیگم کے دل کو کسی صورت قرار نہیں تھا۔ ہوک سی ان کے کلیجے میں اٹھتی اور آنکھوں سے ریلے بہہ نکلتے۔ اپنے سینے سے مبارز کی ایک قمیص چمٹا رکھی تھی۔ رہ رہ کر گریبان کو بوسہ دیتیں۔ کبھی کف اپنی مٹھیوں میں لیتیں کبھی کچھ کبھی کچھ۔ ایک تمنا دعا بن کر لبوں سے پھوٹ رہی تھی۔ کاش مبارز چلا آئے۔

مگر ان کی دعائیں قبول نہ ہوئیں۔ کئی دن گزر گئے۔

توصیف الرحمان صاحب بڑے برہم تھے۔ دوسرے معنوں میں آپے سے باہر۔ شبانہ کو گھر واپس لے گئے۔ اور بیوی بچوں کے سامنے وہ دہاڑے ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ شبانہ کی والدہ الگ متفکر تھیں۔ انہیں اگر غم تھا تو صرف اپنی لڑکی کے مستقبل کا۔ کیا کرے گی وہ۔ پہاڑ سی زندگی سامنے ہے۔ کرید کرید کر شبانہ سے حالات پوچھے مگر اب وہ اپنی حماقت اور جلد بازی پر پچھتا رہی تھی۔ ماں کو صحیح حالات نہیں بتائے۔ ٹال مٹول کر گئی۔ انھوں نے بھی زیادہ اسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بس سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"خیر جو گزری گزری۔ جیسے پہلے رہتی تھیں اسی طرح اب بھی رہو۔ سمجھ لینا کہ شادی ایک کھیل تھا۔ اللہ اصل خیر سے مبارز میاں کو لائے۔ میں تو دھوم سے نیاز کروں گی۔"

شبانہ خاموش رہی۔ یہ حقیقت تھی کہ اسے پہلی بار مبارز سے محبت ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت کے سحر نے شکیل کی یاد اس کے دل سے نکال دی۔ وہ اپنی پہلی محبت کو بچپن اور ناتجربہ پر محمول کر رہی تھی۔

مبارز نے بڑی [illegible] اپنا گرویدہ کر لیا تھا! شبانہ کو [illegible]

ایک بات یاد تھی۔ اس کی شرمیلی سی ہنسی۔ سر جھکانے کا بے ساختہ انداز۔ لہجے کا ٹھہراؤ۔ قد و قامت۔ آواز کا تاثر۔ اور اس کی زندگی کا پہلا اور آخری بوسہ جس کی تپش و حدت ابھی تک اس کی پیشانی پر زندہ تھی!۔

مبارز نے اس سے صاف صاف اپنے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن وہ اس کی والہ و شیدا تھی اور اسے محبت کرنے پر مجبور۔ وہ اپنے دل کو ٹٹولتی تھی۔ آخر یہ کون سا جذبہ تھا کہ ایک شخص کی نفرت کے بدلے میں وہ اس سے پیار کر رہی تھی!۔ مگر وہ اپنے نفس کا بھی تجزیہ نہ کر سکی۔ اس کی نیندیں حرام آرام چین باطل ہو گیا۔ راتیں بلائے جان دن کرب انگیز تھے۔ ایک طویل درد مرگ سا انتظار تھا!۔ جس نے اسے پگھلا پگھلا کر تھکا تھکا کر پوست استخوان بنا دیا تھا ماں باپ پریشان تھے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟!۔ بھائی چند روز سمجھا کر اظہار تشویش کر کے اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ بہنیں پرائے گھر کی تھیں۔ لے دے کے شبانہ کے ماں باپ تھے اور بس۔ کبھی کبھی سحابی آ نکلتی۔ حنا بھی سسرال پر جا چکی تھی!۔

سحابی اس کی غمگسار بننے کی کوشش کرتی۔ روز ہی آتی۔ ایک دن اس نے بڑے چہکتے سے کہا۔

”شکیل صاحب آئے ہیں!۔

شبانہ کے لبوں پر ایک حسرت نصیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”فرصت مل گئی یہاں آنے کی“

”دیر سے بیٹھے ابا سے باتیں کر رہے ہیں۔

خدا خیر کرے“۔ شبانہ ڈر گئی۔ ”اب کیا ہونے والا ہے۔ کہیں پیام تو نہیں

کہ ڈیڈی کے خیالات بدل جائیں۔ انھوں نے ابا جان کے سامنے بڑے طیش
میں کہا تھا کہ وہ پھر میری شادی کر دیں گے!"
"بڑی وہمی ہو گئی ہو" سمی بی نے کہا۔" بھلا یہ بھی کہیں ممکن ہے کہ ایک
شادی کے ٹھیک پچیسویں روز لڑکی کی دوسری شادی کر دی جائے۔!"
شکیل نے شبانہ سے ملنے کی اجازت چاہی۔ وہ یہاں ہمیشہ آتا جاتا رہا
تھا!۔ اب تو کسی قسم کی کوئی پابندی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ توصیف صاحب بھی
کچھ اور سوچ رہے تھے۔ شکیل کو اجازت دے دی۔ وہ اس طرح شبانہ کے
پاس آیا۔ جیسے کسی کا پرسہ دینے آیا ہو۔ رنجیدہ اور متفکر۔ شبانہ نے اسے
دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اور آنچل اپنی انگلیوں پر لپیٹنے لگی!۔
شکیل اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عجیب سی تباہ حال لگ رہی تھی امی جانی
چائے لانے کا بہانہ کر کے اٹھ گئیں۔ شکیل اس سے بڑی دور بیٹھا رہا۔ ماضی کی
خوش رنگ ساعتیں تیلیوں کی طرح اس کے ذہن کی وسعتوں میں اڑتی پھر رہی تھیں
پھر اس نے حواس اکٹھا کر کے مدھم لہجے میں کہا۔" شبانہ۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت
بنا رکھی ہے۔ میں تو تمھیں پہچان بھی نہیں سکا!۔ مجھے پوری امید ہے کہ ایک
نہ ایک دن مبارز صاحب ضرور واپس آئیں گے۔ میں ان کے دوستوں سے ملا تھا!۔
میں اطلاع دینے یہاں آیا تھا بہت سے ان کے احباب ایک خاص مشن کی
طرح ان کی تلاش پر مستعد ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی نہ کوئی خوشخبری تم
تک جلد یا بدیر پہونچ ہی جائے۔ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں
ہونا چاہیئے۔"
یکبارگی شبانہ کی نظروں میں وہ بہت بلند ہو گیا۔ وہ تو سمجھی تھی جانے
کتنے جگر خراش اور زہر میں بجھے طعنے سننے پڑیں گے۔ اس کی پرنم آنکھیں شکیل

کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اس کا سر جھک گیا۔

"شبانہ! انسان کے سب دن یکساں نہیں ہوتے!"

"آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہوئی شکیل صاحب۔ میں نے بدعہدی کی ہے آپ سے!"

"سب کچھ بھول جاؤ شبانہ۔ یہ تو ازل سے لگا بندھا قانون ہے۔ غربت کبھی امارت سے ٹکر نہیں لے سکتی۔ سنگ و شیشہ کا کیا مقابلہ۔ کرچی کرچی تو بے چارے شیشے ہی کو ہونا پڑتا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ پھر آنے کی کوشش کروں گا۔۔۔ خوش رہا کرو شبی! خدا کے لئے اپنے آپ پر رحم کرو۔ تمھاری زندگی اتنی بے حقیقت تو نہیں کہ آہوں اور آنسوؤں کی نذر ہو کر رہ جائے۔"

"آپ ہی لے چلئے مجھے اس بے رحم سنگلاخ دنیا سے کہیں دور۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے میں لمحہ بہ لمحہ مر رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ رگ رگ سے جان نکل رہی ہے۔ رہ رہ کر سینے سے سانس ٹوٹ رہی ہے۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے میں بھاگ جاؤں۔ گھر سے۔ دنیا سے۔ معلوم نہیں کون سے صحرا ویران بیابانوں اور جنگلوں میں ان کا نام لے لے کر چیختی پھروں۔ شکیل! کہیں سے تو میری پکار کا جواب آئے گا!"

"اتنی ناامید نہ ہو شبی! اچھا وقت دور نہیں ہے۔ حوصلہ رکھو۔" شکیل نے کہا۔ سچائی کانی سے آئی۔

"کوئی مر جاتا ہے تو صبر آجاتا ہے۔" شبانہ بولی۔ "مجھے کیسے صبر آئے۔ مجھے تو ہر گھڑی گھٹ گھٹ کے جینا ہے۔ میں اتنی ناپسندیدہ اور بدشکل ہوں کہ مجھے میرے شوہر نے دیکھنا تک گوارہ نہیں کیا۔"

[illegible] شکیل طنزیہ ہنس پڑا۔ پھر وہ سنبھل کر بولا: "تمھارا خیال ٹھیک

نہیں ہے ۔ میرا تو یہ اندازہ ہے کہ انھوں نے کسی کی ضد پر گھر چھوڑا ہے ۔

"شیکھی صاحب اپنا گروپ کشمیر پر رہے نا ۔ آپ اگر ٹھیک سمجھیں کہ آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر شبانہ کو بھی ہمارے ساتھ کر دیں تو کیسا رہے؟" سحابی نے کہا ۔

"معلوم نہیں وہ کیا سوچیں گے" وہ جلدی سے بولا "شاید نہیں مس قریشی ابھی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے ! ۔ میرا تو یہ مشورہ ہے کہ شبانہ اپنے گھر جائیں ۔ یہاں ان کا قیام نت نئی غلطیوں کا باعث بن جائے گا ۔ ۔"

"ہاں ۔ یہی تو وہ بھی کہہ گئے تھے کرسی کا خیال رکھنا ۔ !" شبانہ ہنستے ہوئے بولی "مگر مجھے زبردستی ڈیڈی لے آئے ۔ آپ ان سے یہی کہہ دیجئے شیکھی صاحب کہ مجھے اپنے گھر جانے دیں !"

"آپ کے ذاتی معاملات میں میں کس طرح دخل دے سکتا ہوں" شیکھی بے بسی سے بولے "آپ کے ڈیڈی تنگ ہوئے نیلام ہو رہے ہیں ۔ پتہ نہیں وہ مجھے کیا جواب دے دیں ۔ یہ تو آپ ہی کے کہنے کی بات ہے ۔ ۔" پیالی میز پر رکھ کر وہ کھڑا ہوگیا

"میں پھر آؤں گا ۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو ۔ !"

وہ چلا گیا ۔ اور اس کی شخصیت کی مہک کمرے میں پھیلی رہ گئی ۔

سحابی پھر اس سے باتیں کرنے لگی ۔ ایک طویل بے کیف دن آہستہ آہستہ غروب کی آغوش میں سمٹ رہا تھا ۔

"مجھے امی بے حد یاد آتی ہیں ۔ سحابی !" شبانہ نے آہ بھر کر کہا "عجیب دل تھا ان کا ۔ تم نے تو دیکھا تھا ! ایک رات کی رفاقت سے جب مجھے ان کی مفارقت میں بے چین کر رکھا ہے تو پھر ان کا کیا حال ہوگا ۔ جس نے اُن

پالا پوسا اتنا بڑا کیا۔ جس کی آنکھوں کے سامنے وہ اب تک رہے ہوں گے۔ تم ڈیڈی سے میری طرف سے کہو۔ سحاب۔ وہ مجھے اجازت دیں۔ میں امی کے پاس جاؤں گی!"

سحابی کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر شبانہ کی درخواست سُن کر توصیف صاحب نے بری طرح اسے جھڑک دیا۔

"ہوش کی دوا کرو۔ کیا زندہ کا سوگ منانے جاؤ گی۔ تمھارا نکاح نہیں ٹوٹا تھا!۔ میں نے فتویٰ لے لیا ہے۔ آج سے دسویں روز اگلے ماہ کی دوسری تاریخ کو ٹھیک سے تمھاری شادی کر دی جائے گی اور بارات اس خبیث بڈھے کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے گی۔۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔"

"ڈیڈی۔!" شبانہ چیخ اٹھی۔

"یہ میرا آخری فیصلہ ہے!۔ جس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔" کہہ کر وہ چل دیئے۔

"امی۔۔۔ اب کیا کوئی نیا ظلم ڈھایا جائے گا مجھ پر!۔" شبانہ رو کر بولی۔

"ان کے حواس ٹھکانے نہیں رہے۔ ارے۔ ان سے لاکھ سر پٹخا۔ پہلے میاں نے طلاق نہیں دی۔ اپنی زبان سے تمھیں آزاد نہیں کیا۔ دوسری شادی کیا مذاق ہے کہ گڈے گڑیا کا بیاہ۔ اگر وہ شادی کے بعد اچانک واپس آجائے تو کیا ایک عورت کے دو دو نکاح شوہر اس کے دعوے دار کھڑے ہو جائیں گے مگر نہیں مانتے۔ نہیں سنتے! کہتے ہیں۔ فتویٰ لے لیا ہے جب مرد کو لڑکی پسند نہ ہو۔ باپ کے جبر سے شادی ہو تو زبان سے چاہے ہزار کہے۔ مگر سچے دل میں نکاح نہیں ہوتا!۔ بیگم صاحبہ بلک پڑیں!۔

کیسی زبردستی ہے۔ خالہ جی۔۔!" سعدیہ بولی۔ "آپ انکل کو اچھی طرح سمجھایئے۔ کیا وہ سردار صاحب سے بدلہ لینے کی خاطر اتنا گناہ کبیرہ اپنے سر لیں گے!"

"سر پٹخ کر جان دے دوں گی۔ وہ سمجھے کیا ہیں؟" بیگم نے کہا۔ "ساری دنیا ہنسے گی۔ لوگوں کو منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی!۔ ارے۔ کوئی مذاق ہے۔ لڑکی کی زندگی تماشہ بنا رکھا ہے۔ موئے تمہارے ابو نے!۔ جانے والے سے خدا سمجھے وہ تو منہ کالا کرتا تو اس مصیبت میں ہم کیوں پڑتے!۔ اے میرے پروردگار کہیں سے اسے لائے کوئی۔"

شبانہ دم بخود بیٹھی رہی۔

اس رات وحشت اور ہیبت کے مارے شبانہ کو بخار آگیا۔ بیگم صاحبہ کو ایک ہی تدبیر سوجھ گئی۔ توصیف صاحب بھی دھن کے پکے تھے۔ اپنی ضد ہر حال پوری کرتے۔ لہٰذا بیگم نے شبانہ کی سوء مزاجی کی اطلاع دیتے ہوئے سوکھا منہ بنا کر کہا۔

"آپ کی رائے اچھی تھی۔ شکیل مجھے بھی پسند ہے۔ مگر مصیبت تو دوسری ہے۔ کیسے منہ سے نکلے گی۔"

"کیا بات ہے؟ صاف صاف کہو۔" وہ غرائے۔

"معلوم ہوتا ہے اتنے دن چڑھ گئے ہیں۔ حمل کے آثار ہیں!۔"

"حمل کے آثار؟" سگار توصیف صاحب کی انگلیوں سے چھوٹ کر گر پڑا۔ نہایت شرمناک مغلظات کے درمیان انہوں نے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو وہ یہ تحفہ بھی دے گئے!" در مارے جوش و غضب کے سگار چبانے لگے!۔

بیگم صاحبہ نے اطمینان کی سانس لی۔ "کم از کم سال بھر تو کوئی اندو فکر نہیں

بچپن سے لے کر اپنے فرار تک سارے واقعات یاد آنے لگے۔ ماں کی محبت بے پایاں تھی میری یاد نے انہیں بے قرار کر دیا ہوگا؟ بار بار وہ دل تو ٹوٹ جاتا ہوگا پھر سینے میں چھپٹنے لگی۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔ یہ جدائی اب مجھے گوارہ نہیں۔ میں نے تو کہا تھا۔ ساری دنیا مجھ سے چھوٹ سکتی ہے مگر ماں نہیں۔ میں نے کتنی بدعہدی کی ہے۔ دنیا تو بہت دور مجھ سے چھٹی ہوئی ہے مگر میں نے ماں کو چھوڑ دیا۔

اس کے آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

نیلگوں پھولدار پردہ آہستہ سے سرکا اور پردے کی اوٹ سے زینت کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ریحان کو کمرے میں دیکھ کر کچھ جھجک سی گئی۔ جب اس نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو بے حد حیران ہوئی۔ آہٹ سن کر ریحان نے آنکھیں کھولیں اور بڑی شرمندگی سے چہرہ پھیر کر آستین سے آنسو خشک کرنے لگا۔

زینت کو اندر آنا پڑا۔ وہ کمرہ صاف کرنے آئی تھی۔ وہ پٹکا سر کے گرد بندھا ہوا تھا اور جھاڑن ہاتھ میں تھا۔ ریحان اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی تندرستی اور صحت مندی کے عالم میں وہ قد آور اور قوی ہیکل لگ رہا تھا کہ زینت اس کے سامنے کانور کی ننھی سی گڑیا بن کر رہ گئی۔

”ریحان صاحب ...“ اس نے بے حد اپنائیت سے پوچھا ”آپ رو رہے تھے۔ کیا کچھ یاد آیا آپ کو؟“ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں جکڑ لیا ”معلوم نہیں۔ میں خود بھی نہیں سوچ سکتا۔ مجھے کیا ہو جاتا ہے!“

زینت میز کا گوشہ تھام کر کھڑی ہو گئی۔ ”آپ نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ کیسے یہاں تک پہنچے ہیں۔ کیا سچ مچ آپ کا دنیا میں کوئی نہیں ہے ... ریحان صاحب کیا ہم لوگ آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے؟ ...“

اس کے لہجے کے خلوص نے مبارز کو سر سے پاؤں تک لرزا دیا۔ کہیں یہ بے خبر لڑکی اس کی ذات سے دلچسپی نہ لینے لگے۔۔ اس نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے پاس رہنے کی کوشش کرتی۔ کھانے پر اپنی تیار کی ہوئی چیزیں اصرار کر کے اس کے سامنے رکھتی۔ کمرے کی صفائی کا خیال رکھتی۔ ہنگامی دلچسپی ہی رفتہ رفتہ محبت کا روپ دھار لیتی ہے۔ مبارز خوفزدہ رہتا تھا۔

کیا کیجئے گا۔ مجھ سے میری باتیں پوچھ کے۔" مبارز نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ "میری زندگی کوئی طربیہ غزل نہیں۔ کربناک نوحہ ہے۔۔۔ میں نہیں چاہتا پچھلی باتیں کسی کے سامنے دہراؤں۔ فائدہ کیا ہے۔۔۔ مسافر کی زندگی۔۔۔ آج یہاں کل کہیں اور۔ نہ قیام ہے نہ قرار۔!"

"تو کیا آپ چلے جائیں گے۔ ہمارے یہاں سے!"

"جی ہاں!۔ میں یہی سوچ رہا ہوں!"

کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے۔ ریحان صاحب؟" زینت کی آواز سے اداسی چھلکنے لگی۔ "ہم سب آپ کا خیال رکھتے ہیں۔ آپ کو دنیا میں کوئی نہیں ہے نا۔ آپ ہم سب کو اپنا لیجئے۔"

رشتے بنائے نہیں جاتے۔ بن جاتے ہیں۔ محترمہ!۔" وہ مدھم لہجے میں بولا۔ "آپ سب کی مہربانی اور خلوص کا بہت بہت شکریہ۔۔۔ لیکن مجھے اپنا بنا کے کوئی اذیت نہ لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ نئے ناطے اجنبی جگہ پر ذہنی خلش اور قلبی کسک کا باعث بن جائیں۔ میں تو بھولنا چاہتا ہوں۔ ماضی حال اور مستقبل سب کچھ۔!"

زینت کا دل ڈوبنے لگا۔ "اتنے مایوس کیوں ہو جاتے ہیں۔ زندگی تو خدا کا عطیہ ہے اسے احتیاط سے رکھیئے۔ دل سے اداسی نکال پھینکئے! کسی کو

بنائیے۔ کسی کے بن جائیے۔ آپ کو اپنی ذات اتنی گرانبار نہیں لگے گی!"

"ٹھیک ہے۔ جہاں جاؤں گا۔ آپ کی نصیحت یاد رکھوں گا!"

ملازم کافی لے آیا۔ شاید زینت کہہ کر آئی تھی۔

آپ میری عادتیں بگاڑ رہی ہیں" مبارز نے مسکرا کر کہا "جب میں کہیں اور ہوں گا۔ جب آپ نہ ہوں گی۔ تو مجھے اتنے خلوص سے کون کھلائے پلائے گا"

"ہم سب کو چھوڑ کر کہیں نہ جائیے۔ ریحان صاحب... کہیں نہ جائیے!"

شاید وہ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے۔ لیکن وہ کہہ نہ سکی۔

"کیوں؟ کیا آپ نہیں چاہتیں؟"

زینت سر جھکائے کافی بنا رہی تھی۔ اس کا چہرہ لالہ فام ہونے لگا! اس نے سر اٹھا کر مبارز کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں کوئی اجنبی کہانی نہیں لکھی تھی۔ وہ انی بوجھی داستان تھی۔ جو وہ اپنی رخشندہ کی پرنم آنکھوں سے بھی پڑھ چکا تھا!

"کیا آپ کی بات کا جواب دینا ضروری ہے؟" زینت نے مدھم لہجے میں کہا اور کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ مبارز گڑبڑا گیا۔ اس کا اندیشہ صحیح نکلا۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔ ویسے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی ساری داستان زینت کو سنا دے۔ لیکن اسے یہ بھی یقین تھا۔ زینت اس کی کہانی پر یقین نہیں کرے گی!

"میں کسی کو آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتی۔" زینت کہہ رہی تھی "عجیب ہے غم اور دکھ سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میں سوچنے لگتی ہوں کہ ان رونے والے کا دکھ میرے سینے میں اتر آئے۔ میں اسے مسکراہٹوں کی سوغات پیش کر سکوں۔ آج کل کی دنیا میں ہنسنا بڑا مشکل کام ہے... آپ تو بہت آنسو بہا چکے ہیں۔ شاید آپ کو خبر نہیں۔ جب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ایک بار سرسام ہو گیا

"دیہاتی ہیں، تو ہم لوگ بھی نہیں۔ جناب!" مبارز نے خود کو بغور دیکھ کر پھر ان کی طرف دیکھا۔

"مقابلہ کرو" وہ جوش میں بھر کر بولے "میرے ہاتھ کا اپنے زمانے میاں وہ دہاتا کر بڑے بڑے پہلوان کترا کر پاس سے نکل جاتے تھے۔ صبح سویرے خالص دودھ شکی سے منہ لگا کر پی جاتے تھے۔ تم لوگ ایک گلاس پانی سا دودھ ہضم نہیں کر سکتے! ۔ جب میرا تبادلہ ٹیٹا گڈھ سے ہوا تھا۔ اور میں جنگلات کا امین بن کر تنہا پہونچا تھا۔ تب تو فقط لاٹھی سے ریچھ کا شکار ہے!"

اتنے میں دروازہ کھول کر جرار اندر آگئے۔ خوب مسکرا رہے تھے۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولے "

آج میں جلدی چلا آیا" وہ کبیر صاحب کی طرف دیکھ کر بولے "ابا جان... آپ کا خیال ٹھیک نکلا۔ ریحان کا تقرر ساجد صاحب کی جگہ ہو گیا۔ تقرر کے کاغذات کبھی مل جائیں گے۔ لیجئے جناب مٹھائی کھلایئے "

"جی ہ" مبارز نے حیران ہو کر پوچھا "تقرر کے کاغذات۔ کیا مطلب!"

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔ آپ ہمارے کو لیگ تھے؟" جرار نے کہا "یونیورسٹی سے ایک صاحب مزید تعلیم کے لئے امریکہ گئے ہیں۔ ان کی جگہ تم کھپ گئے۔!"

"م ۔ مگر۔ کس طرح . . . ."

"اس طرح کہ پہلے والد صاحب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ موجودہ تمام اراکین تعلیم سے ان کے گہرے مراسم ہیں۔ انھوں نے کل ہی چانسلر صاحب کو فون کر دیا تھا۔ فزکس اور کیمسٹری۔ غالباً تم نے کہا تھا کہ تم سائنس کے امیدوار تھے۔!"

"جی ہاں!"

"بھئی یہ خوب ہے۔ بیٹے پھر سوچوں میں غرق ہو گئے!" جرار نے شکوہ کیا۔

"اب کیا بات ہے؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ میں خواہ مخواہ بار بن گیا ہوں آپ سب پر!"

"ارے؟" جرار نے قہقہہ لگایا۔ "میرے پیارے دوست!۔ تم صرف خوبصورت ہی رہ گئے ہوتے تو بہتر تھا۔ مگر تم تھوڑے بہت بیوقوف بھی ہو۔!"

"خیر بار ہی سہی" کبیر صاحب نے قہقہہ لگایا۔ "یہی سمجھ کر جرار نے تمہیں اپنے کندھے سے اتار پھینکا۔ اب اپنی روزی آپ پیدا کرو!"

"بہت اچھے! بیان" جرار نے تحسین کی طرح تالی بجا کر داد دی۔

"سنجیدگی سے سوچئے۔ میں یہاں ہمیشہ تھوڑی ہی رہوں گا۔ میں تو چلا جاؤں گا"

"دیوانے نہ بنو۔ ریحان۔" جرار نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "آخر یہاں کیا برے ہو۔ جہاں جاؤ گے۔ یہی کرو گے۔ محنت اور روزی۔ آسمان سے تو من و سلویٰ تمہارے لئے اترے گا نہیں! بیٹھے بٹھائے ایسی اچھی جگہ مل گئی ہے۔ ایک ہزار روپے ماہوار۔ اعلیٰ تعلیمی ماحول۔ اور پیشہ بھی تمہارے لئے نیا نہیں۔ پھر کیا دشواری ہے؟"

"کتنے احسان کیجئے گا مجھ پر؟"

"بکواس۔ احسان۔ احسان کی رٹ لگا کر ہمارے احساسات کو مجروح نہ کرو" جرار نے تند لہجے میں جواب دیا۔ "ہم احمقانہ احساسات نہیں رکھتے۔ یہ نازک خودداری ہے۔ کیا سمجھے؟"

"ڈانٹو نہیں۔ ڈانٹو نہیں۔۔ پیارے سمجھاؤ" کبیر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی وہ ہم میں نیا ہے۔ رفتہ رفتہ گھل مل جائے گا۔۔۔ اُف خدا۔ پھر وہی مصیبت۔۔ بحث کرتے کرتے یہ بات۔ کہ پھر سر گھومنے لگا! ۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گئے!۔

"ابا جان ۔آپ مسلسل پابندی سے دوا بھی استعمال نہیں کرتے! ۔جرار نے کہا
کھاتا تو ہوں ۔۔" وہ بے بسی سے بولے "۔ گرسردیوں میں یہی آفت آجاتی
ہے ۔ دوران سر۔ بار بار سوتے سے اٹھنے کی حاجت ۔ پیٹ میں قراقر ۔
افسوس افسوس ۔ میں تو بیماری کا گھر بن کر رہ گیا ہوں "۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے ۔ تب جرار نے کہا " ابا جان کو صرف وہم
گھیرے رہتے ہیں! ۔ امی جب تک زندہ تھیں ۔ انھیں بچہ بنائے رکھتی تھیں۔
ان کے بعد ویسی خبر گیری اور نگرانی انھیں مل نہ سکی ۔ بے چارے خفقانی ہو کر رہ گئے
عناصر قدرت کی تبدیلیوں سے ڈرتے ہیں ۔ موسم بدلے تو وہ بھی بدل جاتے
ہیں ۔ میں تو حتی الامکان خبر رکھتا ہوں ۔ لیکن وہ میرے شاکی ہیں ۔ انسانی
بیماریوں کو میں وہم سمجھتا ہوں! "

درحقیقت کبیر صاحب نہایت تندرست اور لمبے چوڑے آدمی تھے ۔
آنکھوں میں جوانوں سے بڑھ کر توانائی تھی ۔ رخساروں سے خون چھلکتا تھا
مگر اختلاج کے دورے انھیں نوزائیدہ بچے سے زیادہ بدتر اور کمزور کر دیتے
تھے ۔

" اچھا اٹھو ۔ گھومنے چلیں ۔ کبھی پہلے تم نے دولت آصفیہ کا نظارہ کیا
ہے ؟" جرار نے پوچھا ۔

جی نہیں ۔ پہلی بار ان گردو نواح میں آیا ہوں "۔ مبارز نے کہا پھر کچھ
سوچ کر بولا "آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں ۔ جرار بھائی!"

" ابا جان کا وہم ۔ ہے "

"جی ؟ ۔۔۔ ابا جان کا وہم آپ کے بیوی بچے ہیں ؟ "

نہیں یار ۔ یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے! ۔ ہم کل پانچ بھائی تھے! " جرار نے

کہا: "مگر عجیب قدرتی بات ہے۔ سب سے بڑے بھائی کی نسبت لگی وہ شادی
سے پہلے ہی ختم ہو گئے۔ دوسرے کی شادی ہوئی۔ وہ ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ گئے
تھے حادثے میں گزر گئے۔ ان کی بیوی نے وہیں دوسری شادی کر لی۔ تیسرے
بھائی کی بات چیت چل رہی تھی!۔ وہ گھر کی تیسری منزل سے گرے۔
اور چھ ماہ ہسپتال میں ایڑیاں رگڑنے کے بعد بڑی تکلیف اور بے بسی کی موت
مر گئے!۔ میں رہ گیا ہوں۔ مجھ سے چھوٹا بھائی جو تمہارا ہم شبیہہ تھا!۔ بلڈ پریشر
کی نذر ہو گیا۔ اس کا بلڈ پریشر اتنا بڑھا کہ موت کے بعد بھی اس کی شریانوں سے
خون بہنا بند نہیں ہوا۔ آج بھی مجھے یاد ہے۔ سارا کفن اور گہوارے کی چادر خون
میں تر بتر تھی!۔ میں بھلا نہیں سکتا۔ ریحان:"

"بھولنے کی بات بھی نہیں ہے۔" ساز نے جھرجھری لے کر کہا: "مجھے نہیں معلوم
تھا کہ آپ کے دل پر ایسے داغ بھی تازہ ہیں!"

"اور جان کو بھی اختلاج گھیرے رہتا ہے۔ میری شادی کی بات سن کر تو
وہ نیم جان ہو جاتے ہیں۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ اپنی شادی کر کے [illegible]
دوسروں کو غم دوں۔ نہ بھی شادی بیاہ۔ اسی طرح ٹھیک ہے۔"

"تو پھر آپ کبھی شادی نہ کیجئے گا۔" ساز نے پوچھا۔

"نہیں!۔" وہ اوپری دل سے مسکرائے۔ "لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ [illegible]
[illegible] ضرور نصیب ہو [illegible] ہو جاتا [illegible] تب شادی [illegible]
کروں گا!"

"اتفاق سے یہی نحوست [illegible] بھی ہے۔ جس نے [illegible]
[illegible]"

"تو پھر خوب گزرے گی [illegible]" ساز نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ [illegible]

خیر یہ تو تم نے بات ہنسی میں اڑا دی۔ آج میں تمہیں یہاں کی مشہور عمارتیں اور تاریخی
مقامات دکھاؤں گا۔ کل سے تم بزی ہو جاؤ گے۔"

"چلیے۔!" مبارز نے کہا۔ جرار لباس بدلنے چلے گئے۔

پھر مبارز کو پتہ چلا کہ وہ کتنے اکیلے اور اداس تھے۔ سب کے سامنے ہنستے مسکراتے
تھے۔ دراصل ان کی زندگی بھی غموں کا مجموعہ تھی۔ دوستوں کے درمیان وہ قہقہے
لگاتے اور تنہائی میں گم صم سوچا کرتے۔ اسے ان پر بہت ترس آیا۔ عجیب
سی محبت اس کے دل میں بھر گئی۔!

جرار نے اسے باہر سے آواز دی۔ وہ کمرہ بند کر کے ان کے ساتھ چلا گیا!۔

ثریا بیگم کی تشویشناک حالت نے سردار منشن میں گہرا سناٹا کر رکھا تھا۔ ہر وقت
معالج ان کے پاس موجود رہتے!۔ انہیں ایک ایسی چپ لگی تھی۔ جو ٹوٹنے میں
نہیں آتی تھی۔ مبارز کی ننھی سی تصویر دیکھا کرتیں۔ گردوپیش سے بے خبر
ہو کر اپنے آپ سے باتیں کیا کرتیں۔ اس کا کرتہ قمیض چومتیں۔ اندر ہی اندر زار و قطار
روتیں۔ ایسا غم کسی نے دیکھا نہ سنا۔ انہیں ہر وقت یہی فکر کہ بیٹا نجانے کہاں ہو گا۔
نہ انہیں گھر سے دلچسپی رہی نہ گھر والوں سے۔ کون آیا کون گیا کون
بیمار ہے انہیں کچھ خبر نہیں۔ انہیں تو بس یہی یاد تھا کہ ان سے بچھڑا ہوا
نہیں کہاں تھا!۔

سردار صاحب کی ساری اکڑ فوں ہوا ہو گئی تھی۔ وہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے
کہ مبارز... جان سے گزر گیا۔ ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ دم خم رخصت ہو گیا۔

کاروبار اور بزنس کی طرف سے لاپرواہ ہوگئے۔ اپنی سی کوشش مبارز کو ڈھونڈنے کی کی تھی مگر ناکام ہوئے۔

ثریا بیگم نے ایک بار ہوش کے عالم میں طعنہ دیا تھا!۔
اپنی اور توصیف صاحب کی دولت کا انبار لگاکے دیکھئے۔ مبارز کا سا تند آدم بیٹا بن سکتا ہے کہ نہیں۔؟" اور یہ کہہ کر اس قدر پاگل پن سے قہقہے لگائے تھے کہ ان کی صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگا تھا!۔ تبھی سے وہ ہوش کھو بیٹھی تھیں!۔ ادراک اگر تھا تو صرف مبارز کی بازیابی کا۔ ساری ساری رات دروازہ کھلا رکھتیں اور دروازے کے پٹ سے لگی فرش ہی پر بیٹھی رہتیں!۔ لوگوں نے انھیں گریہ کناں لہجے میں بڑبڑاتے سنا تھا۔ آئے گا۔ ضرور چلا آئے گا۔ مجھے نہیں بھول سکتا میں تو اس کی ماں ہوں۔ مجھ سے کبھی الگ نہیں رہا۔ سننے والے ضبط نہ کرسکتے۔ سردار صاحب تو زبان ہلاتے ہوئے ڈرنے لگے تھے۔ وہ انھیں کو قصوروار سمجھتی تھیں۔ حقیقت بھی یہی تھی!۔ اب وہ بھی پچھتا رہے تھے! مگر اپنے پچھتاوے کا اظہار کس سے کرتے؟ پہلے پہل بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ اٹھتی تھیں۔ سردار صاحب نے بیوی کے سامنے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا!۔ ایسی نگاہوں سے انھیں دیکھتی تھیں کہ ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے!۔

دونوں کی حالت قابل رحم تھی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا!۔ ان کا اپنا تھا ہی کون؟۔ ثریا بیگم کی بیماری اور بدحالی کی خبریں خاندانوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ روز کوئی نہ کوئی آتا ضرور تھا۔ مگر بیکار۔ کسی نے بھی تو جانے والے کی خبر نہیں دی۔ ثریا بیگم سب سے بیزار ہوگئیں۔ اب وہ تھیں اور ان کی غمخوار ان کی یادیں۔

تو حبیب الرحمٰن صاحب کے یہاں بھی اطلاع تھی لیکن انھوں نے شبانہ کو سسرال نہیں جانے دیا۔ وہ تو انتہا سے زیادہ ناراض رہنے لگے تھے۔ ایک تو شکیل سے شبانہ کا نکاح نہ ہو سکا۔ دوسرے یہ منحوس خبر کہ شبانہ مفقود الخبر اور آوارہ مزاج داماد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ انھیں یہ بات ہمیشہ برافروختہ کئے رہتی۔ حالانکہ شبانہ ماں بننے کی منزل سے ہنوز کوسوں دور تھی۔ اسے بیگم صاحبہ نے گھر کے کمرے تک محدود کر رکھا تھا!۔ ورنہ وہ اس کے جسمانی نظام میں بظاہر کوئی تبدیلی نہ پا کر مشتبہ ضرور ہو جاتے!۔

نازلی مبارز کی شاگرد تھی۔ وہ کالج سے ایک چکر ضرور سردار منشن کا لگاتی۔ اور وہاں کی خبریں شبانہ کو پہونچاتی تھی۔ اس کا دل تڑپتا تھا! کہ کس طرح اڑ کر وہاں پہونچ جائے۔

اب وہ بچنے والی نہیں ہیں۔ شبی!" نازلی نے کہا "ان کی حالت دیکھ کر پروفیسر صاحب کے ظلم کا اندازہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ سزا بے چاری آنٹی ہی کو ملی ہے۔ نہ تم کو نہ ان کے باپ کو۔ جلاد باپ کا جلاد بیٹا۔ ارے یہ لوگ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے؟"

"تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ نازلی۔ کسی طرح مجھے وہاں پہونچا دو!" شبانہ گڑگڑائی۔

"تمھارے ڈیڈی تو آگ بن گئے ہیں شبی" نازلی کچھ سوچ کر سرخ ہو گئی پھر بولی "کل شام کو تم نے سنا نہیں۔ وہ کس طرح معروف بھائی کے سامنے گرج رہے تھے۔ ہزار گالیاں انھوں نے پروفیسر صاحب کو دیں۔ یقیں نہایت خفا تھے کہ تم۔ ان کے بچے کی ماں کیوں بن رہی ہو؟۔ خدا مجھے بچائے کبھی کوئی ناجائز کام بتے!"

کی ہر خواہش کا انھوں نے احترام کیا تھا۔

شبانہ نے ان کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور پیالی پھینک کر توصیف صاحب نے اسے اٹھایا اور گلے سے چمٹا لیا۔

"وہ نہیں میری بچی۔ میں تو تمھاری ہی وجہ سے کہتا تھا۔ انھوں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ بڑا دل دکھا ہے تمھارا۔ کیا میں نے سوچا تھا کیا ہوا۔" وہ آہ بھر کر رہ گئے۔

"وہی اس کا گھر ہے۔ اسے جانے دیجئے۔!" بیگم صاحبہ نے کہا۔ شبانہ اپنے کمرے میں واپس آئی اور کانپتے ہاتھوں سے اپنا سوٹ کیس درست کرنے لگی۔

اد تیرا دستر دیکھ کر توصیف صاحب نے کہا۔ "بیگم تم سمجھتی ہو یہ دن شبانہ کے آرام کرنے کے ہیں۔ وہاں اس کا کیا انتظام ہو سکے گا۔ اگر کوئی وقت اس پر تکلیف کا آ گیا۔"

آہ۔ باپ کا دل۔ بیگم صاحبہ کو رونا آ گیا۔ سچی بات منھ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "میں کب چھوڑ دوں گی اسے۔ جب ستر رکھے وقت آئے گا۔ دیکھا جائے گا۔" پھر ان کے جانے کے بعد اپنی بدنصیب بچی کی حالت پر آنسو بہاتی رہیں۔ کاش وہ سچ سچ مال بنتی۔ دیا ہے میاں رہ آتے کہ نہ آتے۔ صبح کو توصیف صاحب جب خود شبانہ کو سسرال پہونچانے پر آمادہ ہو گئے تو انھیں بڑا تعجب ہوا۔

"غم سب کا ہے۔ بیگم" وہ بولے۔ "بے چارہ افتخار بھی ٹوٹ گیا ہے۔ میں یہی سمجھا تھا کہ اس کی سازش ہے لیکن اب خیال بدلنا پڑا۔ جو نہیں جب کچھ تو اس کی کچھ ہمت بندھ جائے کہ وہ اکیلا نہیں۔ بیگم سوچ۔ اگے۔"

گئی تھی۔ سرہانے سنگار میز پر اس کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس کی متبسم نظریں شبانہ کو دیکھ رہی تھیں!۔ اس نے تصویر اپنے سینے سے لگالی۔

ہواؤں سے پردے اسی طرح ہل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار اسی رات کی طرح پڑ رہی تھی۔ کوئی مانوس اور بے قرار کر دینے والی مہک اسی طرح کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ سب کچھ وہی تھا! مگر فرد بے جان تھا!۔

اتنے میں آہٹ سُن کر اس نے سر اٹھایا۔ ثریا بیگم دروازے میں کھڑی تھیں۔ شبانہ تصویر تکیے کے نیچے رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

تم آئی ہو۔ بیٹی" وہ بانہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھیں" تمھارے پیچھے کون ہے۔ دیکھو۔ دیکھو۔ تمھارے پیچھے وہ بھی آیا ہوگا۔" انھوں نے شبانہ کو لپٹا لیا۔ پھر سسکنے لگیں" کچھ نہیں۔ نہ ادھر نہ ادھر۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا دیتی ہیں۔ ہائے۔ وہ جہاں کہیں ہوگا۔ اچھا ہی ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے۔ مگر کاش اس سے کوئی جا کر کہہ دیتا۔ رومی تیری جدائی میں تیری ماں بہت بے آرام ہے۔ سچ سچ وہ چلا آتا۔ میری بے تابی کی خبر سن کر وہ نہیں رک سکتا تھا!" ثریا بیگم نے شبانہ کو بھی بے حال کر دیا۔ دیوانہ وار اسکے چہرے کے بوسے لے رہی تھیں۔ شبانہ ہم تن ان کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی!۔

پھر وہ غافل سی ہونے لگیں۔ شبانہ نے انھیں سنبھال کر مسہری پر لٹا دیا۔

سردار صاحب سے مل ملا کر دونوں میاں بیوی چلے گئے۔ انھیں شبانہ نے بلوا بھیجا۔ وہ آئے اور ثریا بیگم کو دیکھ کر خاموش ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "دادا جان۔ ڈاکٹر کو بلایئے۔ امی بے ہوش ہو گئی ہیں!" شبانہ کو ان کا

سامنا کرتے ہوئے بہت شرم آ رہی تھی مگر وہ رہ بھی نہ سکی!۔

ڈاکٹروں کی چارہ گری اب کسی کام کی نہیں رہ گئی۔ بیٹی۔ بس اللہ سے دعا کرو۔ اسی نے حضرت یعقوب پر بھی رحم کیا تھا۔ شاید میرے حال پر بھی کرم کر دے۔!" یہ کہہ کر اٹھے اور چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہیں خود ہوش آ گیا۔ شبانہ تن دہی سے ان کی خدمت میں لگ گئی۔

دوسرے دن عجیب بات ہو گئی۔ سردار صاحب سے ملنے ان کی بہن اور بھتیجے وغیرہ بھی آ گئے۔ بیگم عاصم کا خیال تھا کہ بھائی پھر بدسلوکی کریں گے۔ لیکن انہوں نے بہن بہنوئی کے سلام کا جواب دیا۔ اور اچھی طرح ان کی تواضع کی۔ تنازعہ اور رنجش کا سوال ہی کیا باقی رہ گیا تھا!۔ عاصم صاحب گھر سے کس کے چلے تھے۔ یہاں آ کر دوسرا رنگ دیکھا۔ سارے اختلافات بھول گئے اور پہلی بار۔ رخشندہ نے اس ہستی کو بھی دیکھا۔ جس کی وجہ سے یہ سارا بکھیڑا ہوا تھا۔ رخشندہ یہاں ماں باپ سے ضد کر کے زبردستی آئی تھی!۔ اس نے اپنے دل میں اس ہستی سے حسد اور رشک محسوس کیا تھا!۔ جس نے اس کا مقام چھینا تھا!۔

لیکن وہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔!

کیا یہ نئی دلہن تھی؟۔ اس نے بڑے کرب سے سوچا۔ شبانہ ثریا بیگم کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ میلے سے کپڑے لباس میں ملبوس۔ بال بکھرے ہوئے تھے جسم پر زیور یا سہاگ کی کسی نشانی کا کوئی نام نہ تھا۔ عجیب سی تنی تنی لگ رہی تھی!۔

اس نے ہم دونوں کو تباہ کیا۔ بے اختیار رخشندہ کے دل نے صدا دی۔ مگر

... وہ موتی چنتی رہی ... ایک ... کی صورت میں بکھرتی رہی۔

گھر میں ایک خاموشی چھاپ پڑ ... زن پیدا ہو گئی۔ رابعہ بیگم نے ثریا بیگم کی تمام خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ سردار صاحب بہت ممنون تھے! آج انہیں محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے پھر اپنے ہیں۔ خاص ... سب نے بھی کسی رنجش کو دوہرانا مناسب نہیں سمجھا۔ اب مرنے پر سو درے کیا۔ وہ تو سردار صاحب کے غم میں برابر کے شریک تھے! ... ہو چکا کر چلے گئی تھی! سردار صاحب نے اپنی بہن کو اصرار کر کے ٹھہرالیا۔

شبانہ کو رخشندہ کی صورت میں ایک اچھی سہیلی ملی۔ وہ تو تمام باتوں سے بے خبر تھی! رخشندہ نے پہلے ہی اپنے ماں باپ سے کہہ دیا تھا۔ شبانہ سے ہرگز نہ کہیں کہ وہ کبھی مبارز کی منگیتر تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی! اس نے شبانہ سے سردار صاحب کی سنگدلی کی کہانی بھی نہیں کہی تھی۔

"آپ تو بہت اچھی ہیں۔ رخشندہ بہن ..." شبانہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی "میں نے آپ کو اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ کیا آپ شادی میں شریک نہیں تھیں!"

رخشی کو جھوٹ کا سہارا لینا پڑا "ہم لوگ یہاں نہیں تھے۔ شبانہ بہن! اگر ہوتے تو ضرور شریک ہوتے!"

"عجیب سی شادی تھی ... ؟" شبانہ بولی "آپ نے شادی کو اس طرح غم میں بدلتے کہیں نہ دیکھا ہوگا ... وہ بھی مجبور تھے! ... کیا کرتے! چلے گئے!"

"کیا مجبوری تھی۔" رخشندہ کا دل دھڑکنے لگا۔

"وہ ان کی بہن ہوتی" شبانہ بے ضبط رونے لگی "میری بھی بہن ... ہم سب ایک ہیں۔ تم سے کیا پردہ۔ تم کسی سے کہنے تھوڑا ہی جاؤ گی ... رخشی!"

میں تمہاری بھابی ہوں۔ میں تمہاری بھابی ہوں۔ تم میرے رومی کی بہن ہو۔

رخشندہ ان آوازوں سے پریشان ہونے لگی۔ اس نے اپنے کان بند کر لئے۔ یکایک شبانہ نے آنکھیں کھول کر گریہ کناں تبسم کے درمیان کہا "اگر مجھے وہ لڑکی مل جاتی۔ تو میں اس سے کہتی کہ وہ اپنے جذبۂ ہمدردی سے تب مجھے زہر دے۔۔۔۔۔ اپنوں سے جیتے جی جدائی قیامت ہے۔ رخشی! میں ہنسی خوشی موت کو گلے لگا لوں۔۔۔ رومی کو اسے بخش دو۔ جس نے انہیں دربدر کیا ہے۔۔۔ کیا محبت اپنے پرستاروں سے خاک چھنواتی ہے۔۔ میں تو کبھی ایسا نہ کرتی۔ کبھی نہیں۔ جس سے محبت کی جاتی ہو اس کے لئے جان دی جاتی ہے۔ اس کی جان لی نہیں جاتی"۔

اور ایک ایک کر کے رخشندہ کے ذہن میں وہ دریچے کھلنے لگے جو عرصہ ہوا بند پڑے تھے۔

"بھابی!" اس نے ہنستے اور روتے ہوئے کہا اور شبانہ کو اپنے گلے سے لگا لیا رات کو جب رخشندہ سردار صاحب کو چائے دینے گئی تب ان کے سامنے دست بستہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"ماموں جان۔۔۔ خدا کے واسطے بھابی کے سامنے کبھی کچھ۔۔۔ نہ دہرائیے گا!"

"اچھا بیٹی" وہ اب بار بار سرد آہیں بھرنے لگے تھے" تم دونوں مظلوم ہو گردن زدنی تو میں ہوں۔ میں نے اپنے ہاتھوں اپنا گھر اجاڑا ہے!"

مبارز نے اپنے لکھے ہوئے مکتوب پر بھی نظریں دوڑائیں۔

امی۔ میری پیاری۔

اپنے رومی کے ہزاروں سلام قبول کیجئے ۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے پیچھے چھوٹ جانے والی دنیا مجھے بھول گئی
ہو ۔ میں چاہتا بھی یہی ہوں ۔ کوئی مجھے یاد نہ کرے ۔ مگر ۔ میں آپ کے
لئے یہ گمان بھی نہیں کر سکتا ۔۔ آپ ہی کی یاد تو ہو گی اتنی ۔
جس نے مجھے آپ سے اتنی دور بے قرار و بے تاب کر رکھا ہے ۔ خدا
تو دلوں کا حال جانتا ہے ۔ مجھے نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام
میرے مقدر میں ہے ۔ ابھی ساری کائنات خواب کے دھندلکے
میں گم ہو جاتی ہے ۔ آسمان پر چاند آ گیا ہے اور نیچے بہار رت
کے دیئے جگمگا رہے ہیں ۔ چاندنی کرنوں کا روپہلا جال بچھ رہا ہے ۔
کبھی تاریکیاں اپنا دامن پھیلاتی ہیں ۔ میں یوں ہی بستر پر لیٹا
ہوں ۔ یک بیک آپ کا خیال مجھے آتا ہے آپ یہاں نہیں ہیں تو
کیا کر رہی ہوں گی ؟ ۔ بس ! میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا
ہے ۔ دل دھڑکنے لگتا ہے ۔ آنکھوں کے آگے آپ کی یادیں چاندنی
بکھرنے لگتی ہے ۔ دماغ میں چنگاریاں بھرنے لگتی ہیں ۔ بستر خاردار
معلوم ہوتا ہے ۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں ۔ اور اندھیرے میں در و دیوار
آگے بڑھ کر مجھے بھینچنے لگتے ہیں ۔ میں روشنی کر دیتا ہوں ۔ مجھے پھر بھی
سکون نہیں ملتا ۔ پھر اندھیرا کر کے میں گھر سے باہر نکل جاتا ہوں ۔ ٹہلتے
ٹہلتے ہی ٹہلتے سحر ہو جاتی ہے ۔۔۔ امی ۔۔۔ میں واپس آؤں گا ۔ بس
انتظار کیجئے ۔۔۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے ۔ ندامت کے بوجھ سے
دبا جا رہا ہوں ۔ میں نے کسی اور کی خاطر آپ کو کیوں رلایا ہے ؟ مجھے
معاف کر دیجئے ۔ آنسو پونچھ لیجئے ۔ آنسو پونچھ لیجئے ۔ میں آؤں گا ۔ ضرور

آؤں گا۔ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے دنیا کا ہر ظلم ہر ستم آسان معلوم ہوگا ... آہ امی۔ میں اٹھائیس سال کے جسم میں آٹھ سال کے بچے کا دل رکھتا ہوں۔ جو اپنی ماں سے الگ ہو کر صبح و شام سسکیاں لے لے کے روتا ہے! تڑپتا ہے۔ ماں کی آغوش میں پہونچنے کے لئے میں پہونچ جاؤں گا امی۔۔ میرا انتظار کیجئے .....

اس کی آنکھیں آنسوؤں کے ہجوم میں ڈوب گئیں اس نے خط پر سر اوندھا لیا اور کسی بچے ہی کی طرح سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا!۔

"مجھ کو آخر کیوں نہیں ... کیا یاد آرہا ہے مجھے۔ بار بار۔ رہ رہ کر۔ اتنا کمزور دل رکھ کر تم نے آخر کس بوتے پر یہ قدم اٹھایا تھا۔ کیا سوچا تھا میں نے ؟ اس طرح خار زار گلستان بن جائے گا۔ راستے کے کانٹے پھول بن جائیں گے۔ مصیبتیں، راحتوں کی شکل اختیار کریں گی۔۔ آہ ... میں بھول گیا رخشندہ تمہیں بھی۔ سب نہ کچھ بھی۔ لیکن ماں کی یاد دل سے کیوں نہیں نکلتی۔ امی یہ کیا ستم ہے ؟؟

ریحان ؟" دروازے کے باہر جرار کی آواز سن کر اس نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھایا اور خط کو مٹھی میں مڑ تڑ کر پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

"کیا کر رہے ہو گھنٹہ بھر سے کمرہ بند کئے!" وہ دروازے میں کھڑے تھے

"جی۔ کچھ نہیں!۔ اس نے پلکیں جھپکا کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی مگر جرار کی نظروں سے اس کی سرخ آنکھیں اور بھرائی ہوئی آواز پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"تم رو رہے تھے، ریحان ؟ کیا بات ہے ... وہ لپک کر پاس آئے اور اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ مبارز کو بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پانا پڑا۔ ہنسنے کی کوشش میں وہ بسورنے لگا۔

میری ایک پروفیسر کی سالگرہ ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ خاص طور پر مجھے مدعو کیا ہے وہیں چل رہے ہیں!" زینت نے خوش ہو کر بتایا۔

"تو پھر آپ تشریف لے جائیے۔" مبارز نے کہا۔ "مجھے تو نہیں بلایا خاص طور پر۔ کیا آپ مجھے ناخواندہ مہمان بنا کر شرمسار کرنا چاہتی ہیں۔"

"دیکھئے بھائی جان۔ یہ بیگانگی کی باتیں!"

"جرار بھائی آپ خود ہی سوچئے!"

"بھائی وہ بات یوں ہوئی کہ اس نے اپنی تمام سہیلیوں میں مشہور کر رکھا ہے کہ اس کے ایک بھائی عرصہ دراز کے بعد اس کے یہاں آئے ہیں۔" جرار نے صفائی پیش کی۔ "چنانچہ ان سب نے غائبانہ تم کو بھی مدعو کیا ہے۔ میں تو خیر جاتا ہی رہتا ہوں!"

"یہ پریشانی کی بات ہے!" مبارز کو پسینہ پیش ہوا۔ وہ اس قسم کی تقریبات سے دور بھاگتا تھا!

"آپ کو میری اتنی سی خاطر بھی منظور نہیں؟" زینت نے شکایت کی۔

"ہاں ہاں چلو۔ کیا حرج ہے۔ کچھ وقت ہی کٹے گا!" جرار نے سفارش کی۔

طوعاً و کرہاً اسے ساتھ دینا پڑا۔ پروفیسر محسن کے یہاں بڑا اژدہام برپا تھا۔ زینت دروازے سے اتر کر اندر چل دی۔ اور جرار پروفیسر محسن صاحب کے پاس جا بیٹھا۔ مبارز سے تعارف کے بعد ان میں ادبی گفتگو چھڑ گئی۔

"آپ شاید طلباء کے ڈیلی گیشن کے ساتھ آئے ہیں؟" محسن صاحب نے مبارز سے پوچھا۔ "بہت بڑا وفد ابھی پچھلے ہفتہ ہمارے اندر کلکتہ سے آیا تھا۔ ہمارے یہاں سے بھی اکثر اساتذہ اور طالب علم ہندوستان گئے ہیں۔ صاحب

ایک قبول صورت خاتون بہت غور سے مبارز کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی گرم نگاہوں نے اسے کچھ پریشان سا کر دیا! جب کافی اور چائے کے آخری دور کے بعد وہ سب رخصت ہونے لگے تب انھوں نے بڑی شائستگی اور ادب کے ساتھ مبارز سے کہا۔

"کیا آپ اپنا تھوڑا سا وقت مجھے دے سکیں گے؟"

"فرمایئے۔" اس نے اخلاقاً مسکرا کر جواب دیا۔

معاف کیجئے گا۔" وہ کچھ جھجکتی ہوئی بولیں۔ "ذاتی سوال ہے۔ کیا آپ کا اسم گرامی واقعی ریحان ہی ہے... یا یہ آپ کا تخلص یا قلمی نام ہے۔؟"

"ادب و شاعری سے مجھے دور کا واسطہ نہیں۔ محترمہ۔ میں نے سائنس میں ماسٹرس ڈگری لی ہے..." مبارز نے کہا۔ اور سوچنے لگا۔ یہ خاتون کون ہو سکتی ہیں!۔

"اگر آپ... دومنٹ کے لئے مجھے معاف کریں تو ایک اور نجی سوال ہے۔"

"شوق سے فرمایئے۔۔!"

"برا نہ مانیئے گا۔ مسٹر ریحان۔ کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے!"

مبارز کا دل دھڑک اٹھا۔ لیکن اس نے مسکرا کر اور جی کڑا کر کے کہا۔"

جی نہیں۔"

تو پھر شاید مجھی کو شبہ ہوا ہوگا۔" وہ کچھ بجھ سی گئیں۔" آپ میرے ایک گمشدہ عزیز سے بہت مشابہ ہیں۔ پہلی نظر میں تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ میرے وہی عزیز ہیں۔ وہ تو شادی شدہ تھے۔ اور مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ کسی بات پر گھر چھوڑ کر روپوش ہو گئے!۔"

"اوہ!" اس نے اس کے خاموش ہونے کے بعد چپکے سے لقمہ دیا۔

"کاش آپ وہی ہوتے!" انھوں نے کہا اور پھر اجازت طلب کی — "جانے سے پہلے شاید میں پھر آپ سے ملوں۔ کیا آپ کا قیام یونیورسٹی کیمپس میں ہے!"

"جی نہیں... میں پروفیسر جمال کا بھائی ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ان ہی کے پاس رہتا ہوں!"

"اچھا۔ عجیب مشابہت ہے" وہ بڑبڑائیں "اگر آپ اور مبارز الدین صاحب پاس پاس کھڑے کر دیے جائیں تو شاید ان کے والدین بھی انھیں الگ الگ نہ پہچان سکیں.. اچھا خدا حافظ۔ میں نے آپ کا بہت وقت خراب کیا۔ میں مدراس ڈیلیگیشن کے ہمراہ آئی تھی مجھے حنا شایان احمد کہتے ہیں۔ آپ کی کولیگ ہوں!"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!" مبارز نے ٹھہرا ٹھہرا کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"اب بھی یقین نہیں آتا" وہ بڑبڑائیں۔ "مگر سچ ہے۔ [illegible] ورنہ کون گوارا کر سکتا ہے کہ ایک حسرت نصیب ماں کو جیتے جی زندہ گور کر دے۔ میں پھر ملوں گی جناب۔ خدا حافظ!"

"خدا حافظ۔" مبارز کے لب ہل کر رہ گئے!۔

وہ سب رخصت ہو گئے۔ اور ایک بار پھر مبارز کا سکون لوٹ لے گئے!۔ بڑی دیر تک جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ کون ہے یہ خاتون۔ حنا شایان احمد! وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔ لیکن اسے کچھ یاد نہ آ سکا!۔ اس کے دل میں تو اس کا لہجہ گونج رہا تھا۔

"کون جیتے جی اپنی ماں کو زندہ در گور کرتا ہے!"۔

پھر اس کا دل اچاٹ ہونے لگا! ۔ اور اس ہنگامے میں سناٹے اور ویرانی کا احساس شدت سے ابھر آیا ۔

ہر وقت سوچنا سوچنا :" زینت کی آواز نے اسے چونکا دیا :" اب کیا ہے میری سہیلیاں تو کہہ رہی تھیں ۔ کیسے آدم بیزار کو لے آئی ہو ۔ سچ مچ غائب دماغ معلوم ہوتے ہیں ۔ آخر آپ کو ہنسنے مسکرانے مل جل کر باتیں کرنے سے اس قدر نفرت کیوں ہے ۔؟!"

"آپ کی سہیلیوں کا خیال ٹھیک ہے ۔ جرار بھائی کہاں ہیں ۔ اب چلنا چاہیئے ۔"

پھر وہی مردم بیزاری :" زینت تنک اٹھی :" اب تو موسیقی کا پروگرام ہے ۔ رات بھر کی فرصت ہے ۔ آیئے اندر چلیں ۔ بھائی جان وہیں کہیں ہونگے!"

"نہیں زینت ! ۔ مجھے موسیقی سے بالکل دلچسپی نہیں ۔ میں گھر جاؤں گا!"

"آپ میرا نام لیتے ہیں تو معلوم نہیں ۔ مجھے کیا کچھ محسوس ہونے لگتا ہے آپ کو نہیں ہوتا ۔"

"کیا ؟" وہ بیوقوفوں کی طرح بولا ۔

"چلئے ہٹیئے ۔ اب یہ بھی میں ہی بتاؤں :" وہ ہنس پڑی :" ایسے تو بدھو نہیں ہیں ۔" پھر اس نے مبارز کا ہاتھ تھام کر کہا :" آیئے چلیں ۔ دیکھئے ساز بجنے لگا ۔!"

"میں بہت تھک گیا ہوں ۔ سو جانا چاہتا ہوں ۔ آپ جرار بھائی سے کہہ دیجئے گا !" اس نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور خفگی دیکھے بغیر باہر کی راہ لی ۔ زینت دم بخود کھڑی تھی ۔ اسے خیال تک نہ تھا کہ یک بیک وہ اتنا وحشی ہو جائے گی ۔ اپنی ہتک پر اسے غصہ بھی بے حد آیا ۔ کچھ دیر بعد جرار آپہ

آئے تو اس نے بہت بڑھا چڑھا کر یہ واقعہ ان سے کہا۔ انھوں نے الٹی اسے تنبیہ کی۔

"زیادہ بے تکلفی ان سے ٹھیک نہیں۔ زینت بی بی۔ تم انھیں بالکل اجنبی سمجھو آپ جو اتنی بے تکلفی برتتے ہیں!" زینت جھنجھلا گئی۔

"میں مرد ہوں۔ تم ناتجربہ کار ناسمجھ لڑکی ہو۔ یہ ہرگز نہ بھولنا"

جبار نے اسے مزید غصہ دلا دیا۔ مگر وہ ان سے کچھ نہ بولی۔ محسن صاحب سے اجازت لے کر گھر آ گئی۔ جبار وہیں رہ گئے۔ کبیر صاحب زینت سے برآمدے میں ملے اور تشویش کن لہجے میں بولے۔

"معلوم ہوتا ہے۔ بیٹی کے نئے حکیم صاحب کی دوا نے کوئی خاص اثر نہیں کیا آج سہ پہر کو پھر کمر میں خفیف سی چبک محسوس ہوئی تھی۔ سینے کی جلن گرانی بدستور۔

ابا جان آپ تو بس بیماریوں ہی کے بن کے رہ گئے ہیں۔ وہ جھنجھلا کر بولی اگر گھر سے باہر نکلئے گھومئے پھرئے۔ دنیا کی ہوا لگے تو یہ بیماریاں نامراد بھی دفع ہوں!"۔ یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بے چارے کبیر صاحب کچھ کھسیائے اور شرمندہ سے وہیں کھڑے رہ گئے۔ جبار کو زینت کا لہجہ بے حد برا لگا۔ کبیر صاحب کی خاموشی نے اسے مزید کبیدہ خاطر کر دیا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آیا۔ بے چارے خوش ہو گئے۔

"آپ نے رات کا کھانا تو کھا لیا ہو گا۔ جناب!" اس نے پوچھا۔

"نہیں بیٹے۔ کہاں؟" انھوں نے کہا۔ "حالانکہ صابر نے پوچھا بھی تھا میں نے کہا کہ لڑکوں کے ساتھ ہی کھاؤں گا!"۔

"دس بج رہے ہیں۔ آپ نے ہمارا انتظار ناحق کیا۔ ہم سب نے سالگرہ میں کھا لیا تھا" جبار نے کہا اور نذیر کو آواز دے کر ان کا کھانا منگوایا۔ کبیر صاحب

بہت خوش ہو رہے تھے۔ اسے بہتیری دعائیں دیں۔ جب انھوں نے اپنے مرض کے متعلق کوئی بات بھی نہیں کی تو مبارز کو بڑا برا لگا کہ وہ غریب محتاط ہو گئے تھے۔ ویسے تو ان کی باتیں ہی سبھی دلچسپی تھی!۔ اس نے خود ہی چھیڑا۔

"اب آپ کے گھٹنوں کے درد کا کیا حال ہے جناب؟... سردیوں میں اکثر جوڑوں کے درد تکلیف پہنچاتے ہیں۔!"

وہ خوش ہو کر کھانا کھاتے گئے اور بڑی تفصیل اور بے حد دلچسپی سے اپنے متعلق باتیں کرتے رہے۔ مبارز اس لئے اور زیادہ ان کے پاس بیٹھا رہا کہ کہیں تنہائی سے زینت فائدہ نہ اٹھائے۔ وہ جرار کو کسی بھی غلط فہمی کا موقعہ دینا نہیں چاہتا تھا!... میر صاحب کھانا کھا چکے تو وہ انہیں سہارا دے کر کمرے میں لے آیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر وہ خود ہی بولے۔

"اچھا میاں۔ اب جاؤ سو جاؤ۔ غالباً گیارہ بجنے والے ہیں!"

مبارز نے گھڑی پر نظریں دوڑائیں۔ اور اٹھ کھڑا ہوا پھر چلتے چلتے پوچھا "آپ کی کوئی دوا اس وقت کے استعمال کی تو نہیں ہے۔ میں دیتا ہوا جاؤں۔ آپ بستر سے اٹھنے کی تکلیف نہ کیجئے!"

"خدا تمہاری مرادیں پوری کرے۔ میاں ٹھیک یاد دلایا۔ بس وہ چھوٹی شیشی میز سے اٹھا دینا۔ پانی میں خود لے لوں گا!"

"پانی تو موجود ہے جناب" اس نے انہیں گلاس بھی تھما دیا۔

"میاں۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا جناب جناب۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ بس دادا مجھے کہا کرو جو سب کہتے ہیں۔ کیا تم میری نظروں میں جرار سے کم ہو۔ آئندہ میں نہ سنوں۔ سچ کہتا ہوں۔ بڑی کوفت ہو گی!"

رات کے گیارہ بجے وہ تھکا ہارا اپنے کمرے میں آیا اور احتیاط سے دروازہ

بند کرلیا۔ نیند باوجود لاکھ انکار کے اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ عجیب
سی خلش دل میں کروٹیں لیے رہی تھی۔ وہ کون خاتون تھیں جنھوں نے اس کا
سکون درہم برہم کرکے رکھ دیا تھا۔ ہزار اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ
رسکا! ۔ کمرے کی روشنی گل کی۔ اور کھڑکی میں آکر کھڑا ہو گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک وہ کسی واقعہ کو بھی
ذہن و دماغ سے محو کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا! ۔ رخشندہ کی بے بسی۔ اپنی
بے دست و پائی۔ سردار صاحب کی ضد۔ اپنی زبردستی کی شادی۔ شبانہ
سے لمحاتی ملاقات... سب کچھ تو من وعن یاد تھا۔ آخر میں اسے اپنی امی یاد
آئیں اور پھر سے سوچوں کے تانے بانے بکھرنے لگے۔ اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت
تھی۔ انھوں نے سگی ماں سے بڑھ کر اسے محبت دی تھی۔ ویسے سگی ماں کا کوئی تصور
ہی اس کے پاس نہیں تھا! ۔ اس نے ان ہی کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اپنے
مرحوم بھائی کے حصے کا دودھ پیا تھا! ۔ بڑی ہوش مندی کی عمر تک وہ ان سے چمٹا
رہا تھا! ۔ حالانکہ سردار صاحب خفا ہوتے رہتے تھے لیکن دو بارہ سال کی عمر
تک ماں کے ہاتھ سے کھانا کھاتا رہا۔ ان کے پاس سوتا رہا! ۔ ڈرپوک بے انتہا
تھا۔ جب وہ غسل خانہ جاتا تب بھی وہ اس کے پاس کھڑی ہوا کرتیں۔ اگر اسے
سکول سے آنے میں دیر لگتی تو خود گاڑی لے کر پہنچ جاتیں۔ اپنی محبت کے مارے
انھوں نے اسے بالکل بچہ بنا رکھا تھا! ۔ وہ بھی ساری دنیا سے کٹ کر صرف
ماں کا ہو کر رہ گیا۔ ان سے غیر معمولی محبت کرتا تھا! ۔ وہ تو اس کے پیچھے دیوانی
تھیں۔ ان کی محبت بے پایاں تھی۔ بے حد و انتہا۔ اور اب سب سے زیادہ سے
انھی کی یاد گلے لگائے ہوئے تھی۔ روز اپنی ماں کے نام خط لکھتا۔ روز انھیں نذر آتش
کر دیتا۔ کبھی بھجوانے کی ہمت نہیں کی۔ کہ اگر سردار صاحب اپنے کاروباری۔

رشتہ داروں کی فوج لے کر آپہونچے تو پھر انہی لیل و نہار میں زندگی گزارنی ہوگی
جن سے پیچھا چھڑا کر وہ بھاگ آیا تھا۔

ان کی یادیں روز بروز گم صم ہوتا گیا۔ بہوت اور بھولا بھٹکا سا! حنا
نے مل کر اس کا رہا سہا سکون بھی غارت کر دیا۔ یہاں اسے ہر طرح کا آرام نصیب
تھا! بزار کے دل میں خدا نے خود بخود اس کی محبت ڈال دی تھی۔ اس کی
ذرہ ذرہ سی ضروریات پر وہ نظر رکھتے تھے اس کے بغیر انھیں چین نہ آتا!۔
جو کچھ وہ اپنے لئے چاہتے۔ سب سے پہلے اس کے لئے چاہتے تھے۔ کہ
کی آنکھوں کا تو وہ تارہ تھے!۔ جو بے زار ہوئے بغیر ان کے امراض کی ایک
ایک باریک تفصیل نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنتا تھا!۔ اور بے کہے ان کی
دوائیں یاد کر کر کے انھیں استعمال کراتا رہتا تھا!۔ اس نے کبیر صاحب کو اپنا
گرویدہ کر لیا تھا۔ بے تحاشہ اسے چاہنے لگے تھے۔

زینت اس سے خفا تھی۔ اب میز پر اس کی پسندیدہ ڈشیں نہ ہوتیں
کمرہ صاف نہ ہوتا۔ وہ حتی الامکان سامنے کبھی نہ آتی۔ مبارز نے اطمینان کی
سانس لی۔ یہی سہی۔ اس کی دوری ہی میں اس کی نجات تھی!۔ زینت کو
بہت ملال تھا۔ خدا جانے کون کون سے خیالی اصنام اس نے دل کے معبد میں
سجا رکھے تھے۔ جو مبارز کی بے رخی سرد مہری اور بے اعتنائی سے ایک ایک
کر کے حسرت و ناامیدی کی سنگلاخ زمین پر گرے اور چکنا چور ہو گئے تھے!۔
راتوں کی تنہائی میں آنسو بہانا اس کا مقدر ہو گیا تھا!۔

جب متعدد مرتبہ زینت طعام خانے میں ان سب کی شریک نہیں ہوئیں
تو جرار نے وجہ دریافت کی۔ ملازمہ زینت کو بلا لائی۔ اس کا منہ بدستور کھنچا
ہوا تھا۔ جرار کے استفسار پر رخ پھیر کر بولی۔

"ریحان صاحب کو میری موجودگی پسند نہیں ہے۔ میں ان کی مرضی کو مجروح کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟" جرار کو بے حد ناگوار گزرا۔ "میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ ریحان سے تم قطعی کوئی واسطہ نہ رکھو۔ وہ تمہاری سہیلی نہیں ہے۔ ایک غیر مرد ہے۔ جس سے تمہارا میل جول مجھے ہرگز پسند نہیں۔ اور تمہیں بھی پسند نہ ہونا چاہیئے۔!"

"بھائی جان ایک گھر میں رہتے ہوئے کیا آپس میں بات چیت بھی نہ کریں۔"

"ضرورت ہی کیا ہے؟" جرار نے تند لہجے میں کہا۔ "کس قسم کی بات چیت کرو گی ان سے۔ یہ مجھے بتاؤ۔!"

"اچھا بھائی جان۔ آئندہ خیال رکھوں گی!" اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

جرار کو تشویش ستانے لگی۔ کہیں یہ پاگل لڑکی کچھ اور تو نہیں سوچنے لگی ہے۔ ریحان انتہائی بے حد پسند تھا!۔ اگر وہ ان کے چھوٹے سے کنبہ میں شامل ہو جاتا تو وہ اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتے۔ مگر اس کا اظہار ان کی خودداری اور غیرت کے منافی تھا!۔

وہ پہلے مبارز کا رجحان دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے انداز سے اس کے دل کا حال جان لینا آسان نہیں تھا وہ تو بالکل برف تھا!۔ بے حس۔ بے جان۔ اپنے آپ میں گم۔ جرار ہی اسے اپنے سب کے درمیان کھینچے پھرتے تھے۔ ورنہ وہ تو گریزاں تھے سب سے... حالات سے۔ ماحول سے اور دنیا سے!۔

اس کے شب و روز بڑے مشغول گزرنے لگے۔ صبح وہ جلد ہی یونیورسٹی

چلا جاتا۔ اور لائبریری میں بیٹھا پڑھتا رہتا۔ شام کو بھی وقت گزار کر گھر واپس آتا۔ پھر جرار اس کے ساتھ گھومنے چلے جاتے!۔ انھیں اس کے حالات پوچھنے کا موقعہ ہی نہیں مل سکا!۔ شب و روز کے اوراق الٹتے رہے!!

حسنا نے اپنے ہوٹل پہونچ کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ شبانہ کے نام ایک تفصیلی خط لکھ کر اپنے شبہ کا اظہار کر دیا۔ اور تاکید کی کہ وہ اپنے یہاں سے جلد ترکسی کو روانہ کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں وہ آدمی جس پر اسے سارز کا دھوکا ہوا ہے۔ پھر کہیں چلا جائے۔

خط شبانہ کو کیا ملا۔ سردار منشن میں ایک کھلبلی سے مچ گئی!۔ ثریا بیگم کا تڑپتا ہوا دل تھا۔ وہ خود جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ اور گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"حسنا کو دھوکا ہوا ہوگا مگر مجھے تھوڑی دھوکا ہو گا۔ میں تو خوشبو ہی سے اپنے لعل کو پہچان لوں گی۔ خدا کے لئے کوئی مجھے نہ روکے۔ بس مجھے گاڑی میں بٹھا دو۔"

سردار صاحب بار بار خط پڑھ چکے تھے۔ انھوں نے عاصم صاحب سے مشورہ کیا۔ وہ جانے پر راضی ہو گئے۔ اور ثریا بیگم کو سنا سمجھا کر کہا۔

"آپ پردیس میں کہاں دھکے کھائیں گی۔ بہن۔ یہ کام تو ہم بخوبی کر سکتے ہیں ہمیں کو جانے دیکھئے آپ فقط دعا کیجئے کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو۔"

ہاں ٹھیک ہے۔ آپ ہی جائیے۔" سردار صاحب نے کہا۔" اخراجات کی فکر بالکل نہ کیجئے۔

"اگر آپ بھی اسے نہ پہچان سکے تو پھر۔!" ثریا بیگم نے مایوسی سے کہا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بہن۔ ارے اسے گودیوں میں کھلایا ہے۔ کیا اپنے ہی بچے کو نہیں پہچان سکیں گے!" عاصم صاحب ہنس دیئے۔

"بھیا۔ خالی ہاتھ نہ لوٹیے گا۔" وہ گڑگڑائیں "ورنہ مجھے زندہ نہ دیکھیے گا۔ میں آپ کی راہ دیکھتی رہوں گی۔ خدا جانتا ہے۔ یہ گھڑیاں کیسے گزریں گی۔"

"اتنی بے صبر نہ ہو بیگم۔ خدا ہی پر نظر رکھو۔" سردار صاحب نے کہا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ عاصم صاحب نے ایک مرتبہ پھر خط پڑھا اور بڑبڑانے لگے —

"عجیب احمقانہ حرکت ہے۔ اتنی اہم بات۔ مگر لکھنے والے نے یہی نہیں لکھا کہ کس جگہ اور کہاں اس نے مبارز کے ہم شکل کو دیکھا تھا۔ یہ محسن صاحب کون ہیں۔ پروفیسر محسن کے یہاں مبارز کا دھوکا ہوا ہے۔ حیدرآباد جیسے شہر میں جہاں سیکڑوں کالج اور ہزاروں پروفیسر ہیں۔ کیا کسی ایک پروفیسر کو تلاش کر لینا آسان کام؟"

"پھر اب کیا ہوگا؟" ثریا بیگم نے تڑپ کر پوچھا۔ شبانہ کے چہرے پر بھی دکھ کے سائے گہرے ہو گئے۔

"میرا مشورہ ہے کہ شبانہ بی بی ایک ایکسپریس خط ابھی اور اسی وقت اپنی سہیلی کے نام لکھیں اور پورا اور صحیح پتہ پروفیسر محسن کا دریافت کریں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ پھر وہ حیدرآباد سے اپنے مستقر واپس چلی جائیں!" عاصم صاحب نے کہا۔

"کیسا طول عمل ہے۔ یہ کام؟" ثریا بیگم کے چہرے پر پھر زردی کھنڈنے لگی۔ پھر وہ اضمحلال کی تصویر بنی گاؤ تکیے پر گر گئیں!

"یہاں سے کب خط جائے گا۔ کب پہنچے گا۔ کب محسن صاحب جواب دیں گے اور کب ان کا جواب ہم تک آئے گا... خدا کو منظور نہیں ہے۔ میں مرنے سے پہلے اپنے بچے کو دیکھ سکوں۔" وہ ڈوبتے لہجے میں بولیں اور یکبارگی اسی روح فرسا صورت حال کے پیش نظر ان سب کی ہمتیں بھی جواب دینے لگیں۔

آپ کسی طرح چلے جایئے۔ پھوپھا جان!" شبانہ چہک کے بولی۔ "اپنے ہوٹل کا پتہ تو حنا نے لکھا ہے۔ آپ اسی سے ملیے۔ اس کے بعد محسن صاحب کا پتہ معلوم کر لینا آسانی ہے۔ وہ خود آپ کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔

"جایئے بھیا۔ رحم کیجئے۔ میرے حال پر۔!" ثریا بیگم نے بڑی خوشامد سے کہا۔

عالم صاحب اٹھ گئے! سردار صاحب فون پر ریلوے اوقات دریافت کر رہے تھے! اس وقت سردار منزل میں بہت سے لوگ تھے سحابی اور نازلی بھی تھیں! شکیل بھی آیا تھا۔ حاکم آنے والا تھا!۔ خط کی فوری اطلاع توصیف صاحب کے گھر پر کرائی گئی وہ بے چارے اپنا ضروری کام چھوڑ کر دوڑے آئے!۔ حنا کا خط سب کے ہاتھوں میں گردش کرتا ہوا پھر سردار صاحب کے پاس پہونچ گیا!۔ وہ پھر خود سے پڑھنے لگے۔

"کتنی تقویت ہے۔" وہ جھلا کر بولے "کم از کم یہ تو لکھا ہوتا کہ پروفیسر محسن صاحب کا کیا پتہ ہے! وہ کون سی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں کہاں رہتے ہیں! نا معقولیت کی انتہا ہے۔ صرف ایک سطر اس طرح کی لکھی ہے۔ "پروفیسر محسن کے یہاں مبارز الدین صاحب کے ہمشکل نظر آئے۔ میں نے نام پوچھا تھا وہ نام نہیں تھا!۔ مجھے پھر بھی شبہ ہے۔" آپ دیکھ رہے ہیں۔ رحمان صاحب۔ کوئی اس سے کیا نتیجہ اخذ کر سکتا ہے!"

"عقل چکر میں ہے۔ بھائی صاحب... واقعی لکھنے والے نے ہم سب کے احساسات سے ظالمانہ مذاق کیا ہے!" توصیف الرحمٰن صاحب نے کہا "میری رائے یہی ہے کہ حیدرآباد کی خاک چھاننے سے پہلے ان محترمہ حنا سے

مذاق کیا ہے۔ ورنہ کیا معنی کہ کسی کالج میں پروفیسر محسن کا پتہ نہیں چلا۔ کوئی انھیں نہیں پہچانتا۔ کیا یہ بات قرین قیاس ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" سردار صاحب نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "وہ ملے گا بھی نہیں کیونکہ میرا دل کہتا ہے اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

شبانہ کے دل سے لگی تھی۔ اسے شکیل کا شدت سے انتظار تھا۔ اس نے ناول [illegible] سے پوچھا۔ بہت افسردہ سا وہ اس سے ملا۔

"کون سی خوشخبری تمھیں سناتا شبی!" وہ اداس ہو کر بولا۔ "اس لیے زمانے تمھیں اپنا منہ نہیں دکھایا... اچھا یہ بتاؤ۔ تم حنا کو قابل اعتماد تو سمجھتی ہو نا۔ پھر تمھارے دکھ سے ایسا [illegible] کیوں کیا ہے انھوں نے!"

"[illegible] اور بھی باتیں گنگناتی ہیں۔" شبانہ نے کہا اور حنا کا دوسرا خط شکیل کو دیا۔ وہ پڑھ کر زیادہ تذبذب میں پڑ گیا۔

"[illegible] ت ہے... [illegible] نام لکھ دیے ہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ پتہ ایک بھی نہیں [illegible] پھر جاؤں ایک تفصیلی اور [illegible] کوشش کرنے!"

"جائیے۔" شبانہ نے دھیمے سے کہا۔ "آپ نے کبھی میری خوشیوں کو چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ مگر شاید خدا کو منظور نہیں ہے!"

"[illegible] کفر ہے۔ میں پھر جاؤں گا۔" شکیل نے کہا۔ پھر بولا۔ "خیر مجھے حنا [illegible] کا پتہ دے دو۔ اب میں جو کچھ کروں گا اپنی ذمہ داری پر..."

"آپ کا کالج..." شبانہ نے حنا کا خط اس کے حوالے کر دیا۔

"کالج..." وہ خفیف سا ہنسا۔ "اس کی کیا حقیقت ہے۔ جب کہ میں اپنی زندگی تک تمھاری خوشیوں پر قربان کر سکتا ہوں۔" وہ نکلا چلا گیا۔

رخشندہ بڑی گم صم رہنے لگی تھی... اس کی دانست میں یہ ساری تباہی عرش

ایک دن یہ کہ سنتے آہی جائے گی۔ نشاط کا بندوبست اپنی زندگی میں کر جاؤں
خدا رکھے بیس سال کی تو ہو ہی گئی۔"

"کب ہے شادی؟" مبارز نے پوچھا۔

"شادی۔ میاں شادی کا ابھی کہاں تذکرہ؟" بابا بولے "پہلے ہمارا کنبہ محدود تھا۔ اب احمد کی شادی کے بعد بڑھا ہے۔ اس کی دلہن کوئی نسبت تلاش کرے گی۔"

"میں بھی خیال رکھوں گا۔ بابا۔" مبارز نے کہا "آپ اس سلسلے میں کوئی جلدی نہ کیجیے گا۔"

"کیا تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہے؟" احمد نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ہے تو سہی۔ لیکن میں پہلے ان سے پوچھ لوں۔" مبارز نے کہا۔

ان لوگوں نے اس کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ رات کو ہزار منع کرنے کے باوجود احمد اس کے ساتھ ہو گئے اور گھر تک چھوڑنے آئے۔
جرار کچھ فکر مند سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ وہ ایک اجنبی کو مبارز کے ساتھ دیکھ کر ٹھٹکے۔

اس نے دونوں کا تعارف کرایا۔ جرار نے بڑی خندہ پیشانی سے احمد کا خیر مقدم کیا مگر وہ متفکر ضرور تھے۔ اس پندرہ منٹ تک ان میں رسمی سی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر احمد رخصت ہوئے۔ جرار اس کی طرف مڑے۔

"تم تو کہتے تھے کہ تمہارا کوئی عزیز دنیا میں نہیں ہے۔ پھر یہ بہن بھائی تم سے ملنے کہاں سے آگئے۔"

"بہن بھائی صرف وہی نہیں ہوتے۔ جو ایک ماں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ جرار بھائی۔ کیا انسانیت کے ناطے وہ میرے بہن بھائی نہیں ہو سکتے؟
خیر بتائیے۔ آپ اس وقت کہاں جا رہے تھے؟"

اس پر دوبارہ انھوں نے بڑی تفصیل سے اسے وہ دردناک حالات سنائے جو کبھی جرار نے سنائے تھے۔ پھر داستان کے اختتام پر خود ہی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کاتب تقدیر نے ایک ہی قلم سے ایک ہی کی تقدیر سب کی لکھ دی ہو۔ مرزا جی کا تقاضہ ہو گیا۔ جرار کو خدا عمرِ خضر عطا کرے۔ میں تو بالکل رضامند ہوں۔"

وہاں سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو دوسری طرف سے جرار آئے۔ بڑے میاں انھیں دیکھ کر بڑی شفقت سے مسکرائے۔

"آپ ابھی تک سوئے نہیں ابا جان۔"

"بس کچھ تذکرہ اسرار میاں نے چھیڑ دیا کہ۔ سنو۔ جرار... بیٹے ہم تھکے تھکے سے رہتے ہیں۔ اور جو تم فکر کرتے ہو وہ سب بیکار ہے... تم اپنا گھر بساؤ، نیند کی فکر کرو۔ میں نے خدا سے عہد کر رکھا ہے۔ میرے خاندان کی شادی اگر جان کی بھینٹ لیتی ہے تو میری جان حاضر ہے۔ میں اب کس کام کا رہ گیا ہوں بس۔ زمین پر بیکار کا بوجھ ہوں۔ خدا کی زمین پر۔ دل زخمی ہے۔ زندگی ناسور بن کر رہ گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا! خدا نے بابر کی جان کی قربانی بیٹوں کی سچی ایک تجویز ہے۔ دوسرا باپ اپنے بیٹے پر قربان ہو جائے گا!۔"

"ابا جان!" جرار کے منہ سے نکل پڑے۔

"میرا دل کہتا ہے میرے بچے۔ میری دعا بارگاہِ عالم نے ضرور قبول کی ہے۔ تب ہی تو اتنے سکون میں اپنے قلب و دماغ میں محسوس کرتا ہوں۔"

"ابا جان! لعنت ہے ایسی شادی پر... جو آپ کی جان کے عوض شادی کی جائے۔ آپ اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ میں ہرگز اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچتا!"

ہمارا اپنے منھ بولے بھائی مبارز کے بڑے شکر گزار تھے۔ اسی کی وجہ سے ان کی بہن اتنے اچھے خاندان میں بیاہی گئی تھی۔

اکثر بابا آ جاتے اور کبیر صاحب سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی۔ دونوں میں اپنے اپنے امراض کا مقابلہ ہوتا! نئی نئی فرضی بیماریاں اپنے اندر تلاش کی جاتیں۔ کبیر صاحب ان کی ہم نشینی میں بے حد خوش ہوا کرتے۔

اکیلا اور اداس اگر تھا تو صرف مبارز تھا!

زینت ابھی تک ناراض تھی، لیکن چند دن اسے تنہائی کے لئے تو وہ خود بخود مبارز کے قریب آ گئی!

پچھلے دنوں وہ بی۔ اے [illegible] کامیاب ہوئی تھی۔ مبارز نے اسے دل سے مبارکباد دی۔ منھ پھیلا کر اس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور طنزیہ لہجے میں بولی۔

شکر ہے آپ کو یاد تو رہا۔ اس گھر میں کوئی ہستی زینت نام کی بھی ہے۔

آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے! مبارز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ جھلا گئی۔

پھر دنیا آپ کو کیا دے آپ نے سارے جہاں کو اپنا باپ، بھائی جان کو اپنا بھائی سمجھا ہے تو مجھ ہی بدبخت نے کیا پرخاش کی ہے کہ اپنا دشمن سمجھتے ہیں!"

مبارز حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا! یک لخت زینت کو اپنے لہجے کی تندی کا احساس ہوا۔ شوخ معصوم انداز میں بولی۔

ریحان صاحب۔ شکوہ اپنوں ہی سے تو کیا جاتا ہے۔ آپ خود دیکھئے میں نے آپ کو کیا کچھ سمجھ رکھا ہے لیکن آپ کی ایک نظر التفات کو ترستی ہوں

آپ کی نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ میری تمام خدمتوں کو آپ نے ٹھکرا دیا تھا
میری کسی خواہش کی پذیرائی آپ نے نہیں کی۔ لوگ تو غیروں کا بھی دل رکھ
لیتے ہیں۔ آپ نے کیا کیا ہے۔ سوائے دل شکنی کے۔"

"ٹھیک ہے۔ زینت!" اس نے ادھوری سانس لے کر سر جھکا لیا۔ "دنیا
والوں کو ہمیشہ مجھ سے شکایتیں ہی رہی ہیں۔ اتنا راندۂ درگاہ۔ بدنصیب
بے حقیقت آدمی ہوں کہ اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں۔ بہتیروں کی
دل آزاری تم نے بھی کی ہے۔ معلوم نہیں اور کتنوں کے دل میری وجہ سے ٹوٹیں
گے... یہ سچی دنیا اور ایسے دنیا والے۔ کیوں نہ چھوڑ دوں۔"

ابھی اس نے کہا ہی تھا کہ زینت نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ کو میری قسم۔ اگر آپ نے میری کسی بات کا برا مانا..." وہ تو عجیب
نکلی۔ سر جھکا کر سسکنے لگی۔

"ریحان صاحب... محبت کی محتاج میں بھی ہوں۔ شاید آپ کو معلوم
نہیں... اتنی سی عمر میں کیا کچھ میں نے نہیں دیکھا ہے۔ امی کی موت مجھے
یاد ہے۔ ارشد بھائی، منجھلے بھیا اور چھوٹے بھیا۔ ایک ایک کر کے جنازوں
کی شکل میں اسی دروازے سے ہمیشہ کے لیے نکلے ہیں۔ ایک بھائی جو بالکل
آپ سے مشابہ تھے وہ ابھی حال ہی میں ختم ہو گئے ہیں۔ ان کی موت کتنی
لرزہ خیز تھی۔ بھلائے نہیں بھولتی۔ ریحان صاحب... دل کے داغ آج تک
کسی نے نہیں دیکھے۔ دل کے زخموں میں جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار
دنیا کی کسی زبان میں ممکن نہیں ہے۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔ کیا میرا
کچھ دل نہیں چاہتا؟ آپ کے سینے میں اگر پتھر نہیں۔ سچ سچ دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا
سچ تو بتائیے۔ کیا آپ نے کبھی کوئی آرزو نہیں کی۔"

دو ایک دن اور باقی تھے۔ کبیر صاحب کی گھبراہٹ دیکھ کر اسے تیمارداری کا فرض ادا کرنا پڑا۔ ان کے فیملی ڈاکٹر کو فون کر کے وہ زینت کے پاس آیا۔

مغرب کا سوگوار وقت تھا۔ زینت کے کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ اس نے بجلی جلائی اور دیکھا کہ وہ دیوار کی طرف چہرہ پھیرے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور یہ محسوس کر کے گھبرا گیا اس کا جسم جل رہا تھا۔

"زینت!" اس نے چپکے سے آواز دی۔

جی؟" بہت مصیبت سے اس نے جواب دیا۔

تم نے چپکے چپکے بخار بلا لیا۔ کہا بھی نہیں کسی سے۔" مبارز نے کہا۔

کس سے کہتی" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ابا جان یوں بھی مریض ہیں اور کون ہے میرا" مبارز نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اس کے لہجے نے مبارز کو بہت دکھ پہنچایا تھا!

ڈاکٹر آگیا تھا اس نے دیکھ بھال کر نسخہ لکھا اور انجکشن دے کر چلا گیا کبیر صاحب کمرے میں موجود تھے۔ مبارز خاموش کھڑا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد کبیر صاحب نے کہا۔

میاں۔ اب کیا ہوگا؟"

میں بالکل اچھی ہوں۔ ابا جان۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ ابھی میں مر نہیں رہی ہوں!

"استغفر اللہ۔ بیٹی۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میاں۔ بہتر ہے کہ بازو کو دبا دو۔"

"جی بہت اچھا!" مبارز نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

زینت سسک سسک کر رونے لگی۔ کبیر صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول

گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی گریہ وزاری کی وجہ کیا تھی؟ مبارز تار
دے کر آیا تو خاصی شام ہو چکی تھی۔ زینت سو رہی تھی۔ وہ کبیر صاحب کو ان
کے کمرے میں چھوڑ کر خود زینت کے کمرے میں آ بیٹھا۔ کبھی وہ بخار کی غفلت
میں سسکیاں لیتی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ غرضیکہ ساری رات کی بے چینی کے بعد جب
وہ صبح کے قریب تھک کر سوئی تب مبارز نے کرسی کی پشت گاہ سے سر
ٹیک دیا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح پچھم کی طرف سے سمٹتی زرد چاندنی میں زینت نے دیکھا کہ وہ
بہت بے آرام سو رہا تھا۔ سردی کے احساس سے اس نے بازو سینے پر لپیٹ
لئے تھے۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ زینت جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ جب
اس کا شعور کام کرنے لگا تو اسے پتہ چلا کہ مبارز اسی کے کمرے میں تھا۔ شاید
ساری رات بیٹھا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ اور چاہا کہ اسے
سیدھا کر دے۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔ کچھ دیر اس کے مضطرب چہرے
کو بڑی وارفتگی سے دیکھتی رہی۔ پھر چپکے سے فرش پر بیٹھی اور اس کی آغوش
میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح کی چہل پہل نے مبارز کی آنکھیں کھولیں۔ جیسے ہی وہ سیدھا ہوا
بڑی حیرت اور بے حد تعجب سے دیکھا کہ زینت زمین پر بیٹھی اس کی
گود میں سر رکھے سو رہی ہے۔ گھبرا گیا۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔
اس عالم میں کسی نے اسے دیکھا تو نہیں۔ اس نے آہستہ سے اسے آواز دی
وہ جاگ رہی تھی سوتی بن گئی۔ مبارز پر بدحواسی طاری ہو گئی۔ اس نے جلدی سے
زینت کو اپنی بانہوں میں اٹھایا اور اس کے بستر پر لٹا کر بڑی بے ساختگی
سے کمرے سے نکل بھاگا۔

کبیر صاحب لاٹھی ٹیکتے ہوئے دالان میں آئے اور پوچھا۔ "کیوں بیٹے۔ اب کیا کیفیت ہے۔ تم نے تو ایسے آرام سے مجھے سُلا دیا کہ بس۔ بھلا ہو۔"

انھیں الٹا سیدھا جواب دے کر وہ اپنے کمرے میں آیا اور دل کی دھک دھک سے پریشان کرسی پر گر پڑا۔ زینت کا یہ جذباتی اقدام اسے پُرخطر لگ رہا تھا۔ عشق و شوق کی عملی منزلوں سے وہ ابھی تک بیگانہ تھا۔ زینت کی اس حرکت نے اس کی رگ رگ میں آگ سی لگا دی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے رگوں میں خون کی بجائے آتش سیال دوڑ رہی تھی۔ کنپٹیوں میں ہلکی سی سنسناہٹ تھی۔ اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"چھوٹے صاحب۔ آپ کو بڑے سرکار ناشتے کے لیے بلا رہے ہیں۔" فضلو دروازے میں کھڑا تھا۔ "تم سے کہو شروع کریں۔ مجھے کچھ دیر ہے" اس نے کہا اور تولیہ اٹھا کر غسل خانہ میں گھس گیا۔ دراصل وہ زینت کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہانے کے بعد بھی وہ اندر نہیں گیا۔ ملازم سے کہا کہ کمرہ بند کر دے۔ اور خود باہر چلا گیا۔

شام کو یونیورسٹی سے واپسی پر اس نے جرار اور نشاط کو گھر پر دیکھا۔

"اتنی جلدی آپ کو تار مل گیا اور آپ آ بھی گئے!" اس نے حیرت سے پوچھا "کیسا تار؟..." جرار نے بھی جوابی حیرت ظاہر کی۔ "خیریت تو ہے۔ تار دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔"

"میاں میں نے دلوایا تھا۔" کبیر صاحب بول اٹھے "زینت کو جب اچانک بخار آ گیا تھا۔ گھبرا کر دلوا دیا۔ وہ تو نہیں ملا۔ یہاں سے تو دو ہفتہ ہوا تمہارا خط آ گیا تھا وہ واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔" جرار نے کہا۔ "آنا چاہیے تھا!"

"زینت بجیا کہاں ہیں؟" نشاط نے پوچھا "عجیب گم صم سی رہتی ہیں۔"

بدل دیجئے! ۔ آپ کے بھائی صاحب لحاظ کے مارے آپ سے کہتے نہیں ۔ مگر ان کی بڑی خواہش ہے کہ آپ زینت بہن کا ہمیشہ کے لئے ہاتھ تھام لیجئے! مجھ سے انھوں نے کئی بار کہا تھا ۔ وہ آپ کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ بے انتہا چاہتے ہیں آپ کو ۔ ان کا منشاء ہے آپ ان کے مختصر سے کنبہ میں ایک رشتہ دار کی حیثیت سے شامل ہو جائیے! "

نشاط ۔ سبا رز نے کہا ۔" جرار بھائی کی خواہش عجیب سی ہے ۔ وہ تو مجھے بالکل نہیں جانتے ہیں کون ہوں ۔ کہاں سے آیا ہوں میرا مذہب کیا ہے میرا نام کیا ہے ۔ اور اب میری منزل کہاں ہے ۔ کہاں جاؤں گا ۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے اگر زینت سے شادی کرنے کے بعد میری بیوی اور بچے نکل آئے تو زینت کا کیا حشر ہوگا ؟ "

نشاط کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ۔" کیا یہ سب سچ ہے ۔ جو آپ کہہ رہے ہیں ؟ تم ہی بتاؤ ۔ تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو ؟ ۔ تمھیں تو میرا نام بھی نہیں معلوم ہے ! "

" تو آپ ہی بتائیے نا ۔ کیوں اپنے ماضی اور اپنی شخصیت پر رات کا گاڑھا پردہ ڈال رکھا ہے ۔ اب تو آپ کو ہم سب پر بھروسہ کر لینا چاہیئے ۔ کتنے افسوس کی بات ہے ۔ ہم آپ کو اپنا سمجھتے ہیں لیکن آپ ہنوز اجنبی اور غیر ہیں ! "

" یہ سب ٹھیک ہے نشاط ۔ مگر میں چاہتا ہوں ۔ میں خود کو بھی بھول جاؤں چلا جاؤں یہاں سے کہیں ۔ ہمیشہ تنہا اور اکیلا رہوں ! "

" تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے ! "

" ارے ! ۔ تم لوگ پیالے بنا رہے ہو کہ دعوت کا سامان کر رہے ہو ؟ "

جرار نے دروازے سے ہانک لگائی ۔

"آپ نے سنا" نشاط نے جھٹ سے چٹکی کھائی "آپ کے چہیتے بھائی ..
بھائی صاحب بھی ... یاد کر رہے ہیں۔"

"احمق ہو ... گے!" جرار نے اس طرح سادگی سے کہا کہ مبارز کو ہنسی آگئی۔

"جب خیال جہاں گشت ہوں جرار بھائی۔ سچ مچ جاؤں گا!" مبارز نے کہا۔
"خدا کی قسم۔ میں تمہیں مار بیٹھوں گا" جرار نے سنجیدگی سے کہا۔

جب چائے کے بعد وہ سب منتشر ہوئے تو جرار نے بڑی سنجیدگی اور اپنائیت سے جواب طلب کیا۔ کچھ رکتے اور جھجکتے ہوئے بولے "ریحان۔ مجھے اس کی بالکل پرواہ نہیں کہ تم کون ہو کیا ہو۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تم میری طرح انسان ہو۔ ان طویل لمحات میں جس طرح میں نے تمہاری سیرت اور عادات کا مطالعہ کیا ہے۔ میں تمہیں ایک شریف متین اور مہذب جوان سمجھتا ہوں۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ کوئی ایسی زبردست ٹریجڈی تم سے منسوب ہے جس نے تمہیں در بدر مارا مارا پھرایا ہے۔ مگر میں نے تم سے کبھی اس کی تفصیل نہیں پوچھی۔ میں سوچتا رہا ہوں میرا خلوص اتنا گہرا اور موثر ہے کہ تم اپنی دانست میں مجھے بھی قابل اعتماد سمجھو۔ میں نے تم پر کوئی جبر نہیں کیا۔ زبردستی تمہاری کہانی سننے پر اصرار نہیں کیا۔ ریحان میں تو تمہیں بے جانے بھی چاہتا رہا ہوں اور شاید ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔ میری تمنا تھی کہ تم میرے گھر کے فرد بن جب تمہاری توجہ اور دلچسپی نے میری زندگی فردوس بنا رکھی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میں تمہارا کتنا شکر گزار ہوں ... ریحان۔ کیا اس احسان اور محبت کا کوئی بدلہ میں تمہیں نہیں دے سکتا؟! کچھ بھی نہیں؟؟!"

مبارز کچھ سوچتا رہ گیا۔ کچھ بھی جواب نہ دے سکا۔

"میں تمھیں مجبور نہیں کرتا۔ ریحان!" جرار نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا۔ "میری محبت کا یہ مطلب نہیں کہ تم نہ چاہتے ہوئے بھی میری مرضی کی صلیب پر خود کو چڑھا دو۔ تم بہت پیارے لڑکے ہو۔ سچ ہے میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے ہو جاؤ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ لیکن کوئی ذاتی مجبوری ایسی ہے جو زنجیر بن گئی ہے۔ جس نے تمھیں جکڑ رکھا ہے۔۔۔ تم الجھتے ہو۔ سوچتے رہتے ہو۔ پریشان ہوتے ہو۔ تو تم اپنی مشکلیں میرے سامنے کیوں نہیں رکھتے؟ کیا تمھیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟ کیا میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتا؟ ریحان میں نے تمھیں آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ جب تک دل پر چوٹ نہیں لگتی آنسو نہیں نکلتے! مگر میں نے تمھارے آنسو نہیں پونچھے۔ کیونکہ میں نے سوچا یہ کام کسی ایسے اپنے کا ہے جو آنسو بھی پونچھے اور مسکراہٹیں بھی عطا کرے۔ جب تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو تم میری اشک شوئی کو بھی بناوٹ سمجھو گے؟"

"بھائی جان!" وہ بے تاب ہو کر انھیں روک دیا۔ "کس نے آپ سے کہہ دیا کہ مجھے آپ پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ آپ نے خواہ مخواہ سوچ کر اپنے دکھ بڑھا لیے ہیں۔ جرار بھائی۔ اندازہ کیجئے۔ اس شخص کی قلبی اور روحانی اذیتوں کا کیا حال ہو گا۔ جو اپنے سارے عزیزوں سے یکبارگی جدا ہو گیا ہو۔ اس کی اپنی حماقتوں پچھتاووں نے خود ہی اس کی نظروں میں گرا دیا ہو۔ پھر وہ کیسے کسی دوسرے کو اپنا راز دار بنا کر اس کی نگاہوں سے بھی گر جائے؟"

"یہ تمھارا بچپنا ہے۔ ریحان!" جرار نے اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا اور تمکین انداز میں بولے۔ "جب کوئی انبار غم بنتا ہے تو اس کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے انسان کا کام ہے کہ وہ دوسرے انسان کا دکھ دور کرے۔ میرا دل زخمی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ دوسرے کا دل کس طرح زخمی ہوتا ہے۔ اگر تمھاری حرکتیں

ہمدردی خلوص اور اپنائیت کے ٹھنڈے سائے میں نہ رکھ سکے
تمہارے کسی کام نہ آسکا۔ تو تم مجھے کیوں خوامخواہ بھائی کہہ کر مخاطب کرو۔ یہ تو
اس رشتے کی توہین ہے!"

مبارز نے طویل سانس لے کر سر اٹھایا اور بلاکم و کاست اپنی ساری داستان
شروع سے آخر تک جرار کو سنا دی۔

جرار خاموشی سے سنتے اور سگریٹ پیتے رہے!

جب مبارز خاموش ہوا تو انھوں نے پوچھا!۔

"پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔۔ ریحان۔ تمہیں واپس جانا چاہیے؟"

"چلا جاؤں گا!" اچانک مبارز اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی اور اسی وقت۔۔
ہو سکتا ہے کہ میرے تلاش کرنے والوں میں آپ کا بھی اضافہ ہو جائے۔
نہیں۔ جرار بھائی۔ خدا کی قسم۔ اب ہم حشر کے روز ہی ملیں گے۔ اس سے
پہلے ہرگز نہیں!"

"بیٹھ جاؤ ریحان۔۔" جرار نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "نہ خود پریشان ہو۔ نہ
دوسروں کو پریشان کرو۔ یہ سوچو کہ تم کب تک اپنی ماں کی یاد سے بھاگتے
رہو گے؟"

مبارز کے لبوں پر خشک سی ہنسی پھیل گئی۔ "جب تک ان کی یاد دل سے
نہیں نکل جائے گی!"

"اچھی بات ہے۔" جرار نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن
کہیں جانا نہیں۔ اتنا سوچ لو کہ تمہاری گمشدگی کے بعد میں بھی پردہ دنیا سے
گم ہو جاؤں گا اور خدائے بزرگ کی قسم۔ میرے بوڑھے ماں باپ معصوم بہن
اور منظور دونوں کا خون صرف تمہاری گردن پر ہوں گے!"

جرار بھائی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

ہسپتال کے ایک بڑے کمرے میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی گہری خاموشی سناٹے کی حکمرانی تھی۔ کبھی کبھی نرسوں کے ہائی ہیل سینڈلوں کی کھٹ کھٹ پختہ فرش پر گونج کر سناٹے کا دل مجروح کر دیتی اور پھر لامتناہی خاموشی طاری ہو جاتی۔

ثریا بیگم لب گور پہونچ چکی تھیں۔ ڈاکٹروں کی ان تھک محنت اور جان توڑ کوشش انھیں زندگی کی چند سانسیں بخشنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ ورنہ توقع تو بالکل نہیں رہ گئی تھی۔ ان کی حالت خطرہ سے باہر تو تھی لیکن اطمینان بخش نہیں تھی۔ بڑے طویل وقفے بیہوشی کے ان پر طاری ہو جاتے۔ اسرار صاحب اندر باہر سے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ آج ان کا کوئی سہارا نہیں رہا تھا۔ وہ دولت جس کی خاطر انھوں نے بہت سے پاپڑ بیلے تھے ان پر ہنستی تھی۔ دولت ان کا گمشدہ بیٹا ان سے نہ ملا سکی۔ دولت ان کی بیوی کو زندگی نہ دے سکی تھی۔ دولت جسے چھوڑ کر وہ ایک دن خود بھی چل بسیں گے۔ نجانے کس کے حصے میں چلی جائے گی۔ اب وہ بعد از وقت کفارہ ادا کرتے۔ لیکن سب بیکار۔

ثریا بیگم کو ہسپتال ہی میں چھوڑ کر عاصم صاحب اور ان کے صاحبزادے اپنے گھر چلے گئے۔ رابعہ بیگم البتہ بھائی کے یہاں پڑی تھیں۔ توصیف الرحمان صاحب بھی مراد کی گمشدگی کو قصہ پارینہ سمجھ کر بھول چکے تھے۔ نجانے کیا گذری ہو شبانہ کی۔ اپنی دانست میں وہ منتظر تھے کہ اس کے ماں بننے کے بعد وہ شاید

ہونے لگے!۔

حنا اپنے والد کے انتقال کے بعد بڑی دل گرفتہ اور سنجیدہ سی اپنی خالہ کے پاس واپس آ گئی!۔ ماں پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ خالہ ہی اس کی بڑی رہ گئی تھیں!۔ یہاں آکر اسے تفصیل سے ساری باتوں کا علم ہوا۔ بڑی بی جو ثریا بیگم کی عیادت کر آئی تھیں انھوں نے خوب بڑھا چڑھا کر ان کی خودکشی کی تفصیل سنائی!۔

حنا ہسپتال پہونچی۔ شام کا وقت تھا!۔ ہسپتال سے لوگ بیماروں سے مل کر رخصت ہو رہے تھے!۔ حنا کو گیٹ کے باہر ہی شکیل مل گیا۔ اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے!۔ حنا کے استفسار پر اس نے اسے برا بھلا سنانا شروع کر دیا۔

وہ وقت کوئی دل لگی کا نہیں تھا!۔ اس نے سرد لہجے میں کہا "انسان پر جب تک کوئی واردات نہیں گزرتی۔ دوسرے کے محسوسات کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا!"

"کسی سے میں نے دل لگی کی۔ شکیل صاحب۔ ہوش میں رہ کر گفتگو کیجئے" حنا نے تیز اور خشمگیں لہجے میں جواب دیا۔ "میں یہاں خالہ جان کی عیادت کے لئے آئی ہوں۔ آپ کی جلی کٹی سننے نہیں آئی" اور وہ جھنجھلاتی ہوئی اوپر چلی گئی!۔

وہ وارڈ کے باہر رخشندہ اور شبانہ ملیں!۔ حنا کے لبوں سے ایک ہلکی سی چیخ نکلا!۔ وہ دوڑ کر شبانہ سے لپٹ گئی!۔ کچھ دیر دونوں ہی روتی رہیں۔ پھر جب حواس درست ہوئے تو شبانہ نے رخشندہ کا تعارف کرایا۔ اور ثریا بیگم کو دیکھنے چلی گئی۔

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بستر پر سکڑی سمٹی ہوئی ثریا بیگم ثریا

لیے کر دئیے کہ سب کے سب سکتے میں رہ گئے!۔

شبانہ جب حسب معمول ثریا بیگم کے پاس گئی تو وہ جاگ رہی تھیں۔ آہٹ پر سر گھما کر دیکھا اور ایک معدوم سی مسکراہٹ ان کے پژمردہ لبوں پر بکھر گئی۔ شبانہ کے دل میں آنسوؤں کا سمندر اُمڈنے لگا۔ اس نے بےتاب ہو کر ان کے گلے میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"امی۔ اب تو خوش ہو جائیے۔ ثنا آئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ امی نے ان کا پتہ چلا لیا ہے۔ وہ جانتی تھی امی۔ اور انھیں لے آئی گی!"

ثریا بیگم کی نیم وا آنکھیں کھل گئیں۔ اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں میں شبانہ کا چہرہ تھام کر بولیں۔ "سچ کہہ بیٹی۔ سچ کہہ... جھوٹی تسلی نہ دے۔ تجھے میری قسم!"

"ہاں امی۔ سچ بالکل سچ۔ آپ ثنا سے پوچھ لیجئے۔ وہ تو خود سے کہنے آئی ہے"

"پھر وہ اسے اپنے ساتھ لیتی کیوں نہ آئی؟!"

"امی" جھجکا کر شبانہ نے کہا۔ "وہ تو پشیمان ہیں۔ آپ کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں۔ انھوں نے بڑا دکھ دیا ہے نا آپ کو؟"

"میں نے معاف کر دیا اسے" وہ ہچکیاں لینے لگیں "اسے کہہ دو بلا لے۔ جلدی آئے۔ کون جانے وہ راہ میں ہو اور اس کے آنے سے پہلے جان میری آنکھوں سے نکل جائے"

"افق آپی سہارا تو پیدا کیجئے کہ ان سے مل سکیں۔ یہ تو آپ ان پر ظلم کر رہی ہیں۔ ان کا کیا حال ہوگا جب وہ آپ کو اس قدر کمزور اور بیمار بستر

تم لیتے ہوئے بولے۔ "یہ قطعی نہ سوچا تھا تم نے کہ اپنے پیچھے کن کو سوگوار چھوڑ جاؤ گی۔؟"

"ایک تھا سوگوار۔ وہی نہ رہا تو کون میرے پیچھے رہتا؟"

"تم مجھے بھول گئیں۔" وہ بڑے پیار سے بولے۔ "سچ کہتا ہوں۔ تم نے اس عرصہ میں مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ میں تو یہی سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ خدانخواستہ تمہیں اگر کچھ ہو جائے تو پھر میں تمہارے بیٹے کو کیا جواب دوں گا۔"

"جائیے اسے لے آئیے۔ اسے کچھ کہئے گا نہیں۔ اب سب کچھ بھول جائیے۔ میں اس سے کہوں گی وہ بھی میری خوشی کی خاطر وہ سب کچھ منظور کر لے گا جو اسے منظور نہیں تھا!"

"بیگم! تم نے پہلے ہی نہیں کہا! اس کی نوبت ہی نہ آتی!"

"پھر وہ دربدر کیسے ہوتا۔ میں اسے دکھ کیسے پہنچاتا! تقدیر کا لکھا یہی تھا!"

کئی لوگ باری باری ڈھونڈ کر واپس جا چکے تھے۔ مگر سرفراز صاحب نے وہاں سے اسے لانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"محبت آ ہی جاتی ہے!" حنا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

شکیل توصیف صاحب سے ملنے چلا گیا تھا! انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے ارادے کو کمزور کر دے۔ فوراً چلا جائے۔ پھر غور سے شکیل کی شکل دیکھ کر کچھ سوچا اور کچھ رقم اس کی طرف بڑھا دی۔

"میں اتنا غیر تو نہیں جناب!"

"تم سب بچے ہم خود غرض بوڑھوں کی ناقدر شناسی کا شکار ہو۔ شکیل میاں تمہاری ذہانت نے تقاضا کیا۔ مبادا کہ تقدیر نے دو بھی! آخر خود کو قصور وار سمجھے

"شاید آپ کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ مجھے معاف کر دیجئے:
میرا مطلب زینت سے نہیں تھا! ریحان" وہ بڑی سنجیدگی سے بولے
"میں تو تم سے کہنا چاہتا تھا کہ۔ کئی دنوں سے مسلسل سوچ رہا ہوں۔ تمہاری
طرف سے۔ کیا حال ہوگا ان ناکردہ کاروں کا جنھیں تم اپنی جدائی کی ناگوار
ناقابل برداشت سزا دے آئے ہو۔ وہ لڑکی جو تمہاری منسوب تھی۔ اور
وہ لڑکی جو تمہاری بیوی تھی۔ اور وہ ہستی جو تمہاری ماں تھی۔ ان سب
کا کیا حال ہوگا؟..."
"مجھے ماضی کو بھول لینے دیجئے۔ جبار بھائی۔ خدا کے واسطے میرے زخموں
کو نہ چھیڑیے۔"
ریحان؟..." وہ اسے چمکار کر بولے "میں تمہارا برا نہیں چاہتا۔
تم مجھے سچ مچ اپنے بھائی کی طرح عزیز ہو۔ میری بات مانو۔ ایک بار اور
آخری بار ضرور اپنے وطن کا چکر لگا آؤ۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔
"آپ نہیں جانتے! میں کس جہنم سے نکل کر آرہا ہوں" اس نے
تلخ لہجے میں کہا "اپنے والد محترم کی سخت گیری کی کہانی میں نے آپ سے
کہی تھی! کیا بگڑ جاتا ان کا۔ اگر وہ میری تھوڑی سی خاطر کر لیتے۔ بار رکھتا!
آپ ان کی دولت و سرمایہ کا اچھی طرح اندازہ نہیں لگا سکتے! انھیں کسی
سرمائے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی بہو منتخب کی۔
پسند کی۔ اپنی مفلس بہن کی لڑکی ٹھکرا دی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دل نام کی
کوئی چیز اگر ہے تو صرف ان کے سینے میں۔ آرزو کسی چڑیا کا نام ہے تو
وہ چڑیا صرف انہی کی مٹھی میں بند ہے۔ حکم اگر کوئی چلا سکتا ہے تو فقط
وہ۔ ان کے سامنے امی۔ میں۔ اور دنیا کے تمام لوگ۔ تمام رشتے ناطے

لاحول ولا قوۃ۔ میں تو انہیں مرد سمجھا تھا!۔"

"تو پھر یہ کیا ہیں؟" نشاط کی ہنسی تیز ہو گئی۔

"لڑکی سے بدتر۔" جرار نے برا سا منھ بنا کر کہا۔ "بدہمت، حساس۔ جذباتی۔ اور بالکل احمق!۔ سمجھیں!"

"ارے ارے۔ یہ تو آپ کیا کہے چلے جا رہے ہیں۔" نشاط نے جرار کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں اپنے پیارے بھیا کے لیے ایسی باتیں نہیں سن سکتی۔ لڑائی ہو جائے گی آپ سے۔ میرے بھیا بہت معصوم بھولے بھالے اور دنیا کے مکر و فریب سے بہت دور ہیں۔ اسی لئے بدتر کہتے ہیں۔ ویسے بہت اچھے ہیں!" اس نے للکار کر کہا۔ "سمجھے؟"

"اچھا اب ختم کیجئے۔" مبارز اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلئے دیر ہو رہی ہے۔ کل کے لئے ابھی کچھ ڈشز بھی تیار کرنی ہیں... شام بھی ہو رہی ہے۔"

"ہاں ہاں چلو!" جرار بھی اٹھ گئے! زینت اور نشاط نے سب سامان باسکٹ میں بھر دیا۔ راستہ بڑی طویل خاموشی میں کٹا۔ جرار کچھ تھکے ہوئے تھے۔ گھر پر اترنے کے بعد وہ اور نشاط سامان لے کر اندر چلے گئے۔ زینت نہ جانے کیوں رک گئی!۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مبارز سے کہا۔

"میری [illegible] بات کو جلد ہی بھول جائیے گا... ایسے ہی دماغی دورے پڑتے ہیں مجھ پر۔ زبان قابو میں نہیں رہتی... مجھے آپ کی بے اعتنائی سے کوئی شکوہ نہیں ہے!"

"[illegible] جرار! جواب بھی کیا دیتا؟" زینت نے پھر جذباتی بن کر کہا! "مگر زندگی گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی سہارا مل ہی جاتا ہے۔ آپ نے اپنی باہوں میں اٹھا کر مجھے بستر پر لٹایا تھا! کیسی عجیب سی سنسنی تھی۔ جو ابھی

تک رگوں میں منجمد ہے۔ وہ مجھے حاصلِ حیات تھے! شاید صرف میرے
لئے!" اور ایک گہری نظر اس پر ڈال کر اندر چلی دی۔

اف، پاگل لڑکی کا کیا حشر ہوگا۔ وہ سوچتا رہا!۔

راتیں سرد ہونے لگی تھیں۔ دس بجے رات سے خاصی خنکی ہو جاتی تھی
اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بڑی رات جا چکی ہو۔ جرار کچھ دیر تک ان کے
ساتھ بیٹھے نوٹس تیار کرانے پر مدد کرتے رہے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے!
اور ان کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بولے۔

دماغ کو آرام دو میاں۔ چل کے سو رہو۔ تھک جاؤ گے!۔

اسے ان کی محبت بڑی اچھی لگتی تھی۔ خواہ مخواہ ہی ان کے سامنے کچھ پڑھا
جانے کو دل چاہتا تھا۔ وہ بھی انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا۔

اتنے میں ملازم نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔ جرار نے بھیجا اسے واپس کہ
وہ نووارد کا نام پوچھ کے آئے!۔

ملازم جلد ہی لوٹ آیا۔ صاحب، پروفیسر حسن کا آدمی ہے۔ ان کے پاس
اپنے جرار صاحب کے نام ایک ضروری تار آیا ہے۔ انھوں نے ابھی اور اسی
وقت جرار صاحب کو بلا بھیجا ہے!

جرار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا! مبارز بھی کچھ سمجھ نہ سکا! بہرحال جرار خود باہر
نکلے! انھیں دیکھتے ہی پروفیسر حسن کے ملازم نے کہا۔

ٹیلی گرام آیا ہے صاحب، پروفیسر صاحب فوراً جرار صاحب
کو بلاتے رہیں!"

معلوم نہیں کیا قصہ ہے۔ جرار نے کہا۔ انھوں نے نوکر کو روانہ کر دیا!
وہ مبارز سے بولے "معلوم نہیں تار کا کیا معاملہ ہے [illegible]!"

ہی کہا۔

"آہ۔ امی۔ آپ چل بسیں!۔"

اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔ جرار کے صدمہ کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا!۔ وہ خود بھی سکتہ میں رہ گئے تھے۔ صبر و ضبط کی تلقین کیا کرتے!۔

"میں چاہتا نہیں تھا کہ آپ کو اس حادثہ کی خبر کروں" محسن صاحب کہہ رہے تھے" مغرب کے وقت یہ مجھے ملا تھا۔ اتنا وقت اسی کشمکش میں گزرا بالآخر ... آپ کو اطلاع دینا پڑی جرار صاحب... لڑکے کو سمجھایئے"

جرار نے بے ضبط ہو کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور مبارز کے ضبط گریہ کا بند ٹوٹ گیا۔ بے اختیار سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

"ریحان" جرار کی آنکھوں میں بھی آنسو اکٹھا ہو گئے۔ وہ اس کے آنسو پونچھتے رہے۔ سر سہلاتے رہے۔ مگر کچھ بول نہ سکے۔ بولتے بھی کیا!۔ بیٹے کو بے طرح غم تھا۔ مبارز اپنی ماں کو کتنا چاہتا تھا! اس کا غم ایسا نہیں تھا۔ جو ... سے بہل جاتا!۔

"میں... میں بدنصیب" مبارز کا گریہ سسکیوں سے گزر گیا۔ اب وہ چیخ چیخ کر آوازے رہا تھا!" مجھے موت کیوں نہیں آ گئی۔ امی کو کہاں سے لاؤں" اور وہ دیوانہ ہونے لگا۔

"ریحان... خدا کے لئے سنبھلو" جرار حواس باختہ تھے۔ محسن صاحب نے اپنا فرض ادا کرنا ... بہت دلنشین پیرایہ میں سمجھانا شروع کیا۔ تسلی دی۔ غمخواری کی۔

"خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔ جرار بھائی۔ ایک خنجر لیجئے۔ میرے سینے میں گھونپ دیجئے۔ میرے خدا اگر میں بدنصیب وطن چلا گیا ہوتا تو حال

وہ تو اس طرح مبارز کو دیکھ رہی تھیں جیسے وہ دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

کبیر صاحب کا مبارز بڑا اچھا دوست بن گیا تھا۔ انھیں اس کے جانے کا بہت افسوس تھا مگر وہ اسے روکتے تو کیسے۔ روکتے! بہت ہی نا تاسف اور نہایت درجہ رنج و قلق کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

بیٹے۔ دل کی عجیب کیفیت ہے۔ وہ بیچارے آنسو پونچھ رہے تھے۔ پر تم یہاں سے ہنسی خوشی جاتے۔ تمھارے آنسو شاید میں کبھی بھول نہ سکوں گا کاش۔ یہ صدمہ تم پر نہ پڑا ہوتا۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ یہ آخری بار میں تجھے رخصت کر رہا ہوں۔ تم پھر کبھی آؤ گے تو میں زندہ نہ رہوں گا!

ان کی بے کراں محبت کا ایک گہرا داغ اس کے دل پر اور لگا۔ چرکے پہ چرکے۔ زخم۔ دکھ اور رنجش۔ اس کی قسمت میں شاید حسرتوں کے سوا کچھ۔ پرسکون اندمال نہیں تھا!

زینت تو سامنے ہی نہیں آئی۔ نشاط نے رو دھو کر اسے خدا حافظ کہا۔

جرار اور مبارز کی روانگی کے بعد وہ دونوں دیر تک برآمدے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں پھر ملازم نے چند لوگوں کی آمد کی اطلاع دی۔

یہیں بلا لیجئے۔ جان۔ ہم تو بیٹھے جاتے ہیں!۔ نشاط بولی۔ کبیر صاحب نے ملازم سے کہا آنے والوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔ اور خود اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے انتظار میں دو نوعمر آدمی اور ایک خاتون بیٹھی تک رہے تھے۔

فرمائیے۔ جناب۔ کبیر صاحب نے علیک سلیک کے بعد بڑی خندہ پیشانی سے پوچھا۔ انھوں نے باری باری سب پر نظریں ڈالیں اور شرمندہ لہجہ میں کہا۔ میری یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ یاد ہی نہیں پڑتا کہیں اس سے پہلے آپ کو دیکھا ہے یا نہیں... تشریف رکھیے!

ہمیں بھی جلدی ہے۔ جناب۔۔!ایک نوجوان نے کہا۔" بڑے ضروری کام سے محترم جرار صاحب سے ملنا تھا!۔ ہم پروفیسر محسن صاحب کے پاس گئے تھے انھوں نے براہ راست یہیں بھیج دیا!"

لیکن میاں وہ تو کچھ ہی دیر پہلے اپنے بھائی ریحان سمیت مظفر نگر روانہ ہو گئے۔"

"خدا کی پناہ۔!" دوسرے نے کہا۔

مقدرات۔۔۔" کبیر صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔" کل ہی ریحان کو تار ملا تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ بے چارہ لڑکا۔ افسوس۔ اس کی شکل آنکھوں تلے پھر رہی ہے۔"

"ماں کا انتقال ہو گیا!" دونوں کے منھ سے بیک وقت نکلا۔

ہاں میاں۔" کبیر صاحب نے کہا۔" غم اس کی برداشت سے باہر تھا۔ جرار ہی اسے لے گئے ہیں۔"

"جناب۔۔ کیا ان کا نام سچ مچ ریحان ہی تھا؟" لڑکی نے کبیر صاحب سے پوچھا۔

نہیں بیٹی۔" کبیر صاحب نے جواب دیا۔" میں تو اسے ریحان ہی کے نام سے جانتا تھا۔ لیکن اس کا اصلی نام غالباً مبارز الدین تھا!۔ بہت بعد کو بتایا اس نے۔"

لڑکی خاموش ہو کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ بڑے گم صم تھے کبیر صاحب سے اجازت لے کر باہر نکل آئے۔

حنا بہن۔ اس صورت حال کو قدرت کی ستم ظریفی ہی کہنا چاہیے۔" شکیل نے کہا۔" سوچ بھی نہیں سکتا!۔ یہ کیا ہو گیا۔ وہ بے چارے وطن واپس گئے

تمہارے دل کا اندازہ ہوا۔ مگر وہ بالکل خاموش اور فکرمند تھے!۔

مبارز کے دل کا دکھ اس کے چہرے پر تحریر تھا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کر اپنے گھر کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

ٹیکسی پورچ کی سیڑھیوں کے بالکل قریب پہنچ کر رک گئی!۔

"گاڑی پارک کرنے کی جگہ وہاں نہیں ہے!" اپنے اسٹول سے اٹھ کر چوکیدار دوڑا۔ اور ڈرائیور کو گھورنے کے بعد اس کی نظر جیسے ہی پچھلی سیٹ پر پڑی۔ وہ بدحواس ہو کر چیخ پڑا۔

"چھوٹے سرکار۔ ارے میرے خدا۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں آپ۔ آ گئے۔ اتریئے اتریئے۔" اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ مبارز اور جرار اتر کر اوپر بڑھ گئے۔ گل خان منہ اٹھا کر اور چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو مبارز کی آنے کی خبر دینے لگا۔

وہ اوپر بڑھتے چلے گئے!۔

مبارز ایک ایک چیز پر حسرت خیز نظریں ڈال رہا تھا۔ اس کی دانست میں تمام رستے پر سوگ ہی سوگ برس رہا تھا۔ جرار اس کی خاموشی سے خاموش تھے۔

ہال تک انہیں کوئی شخص نہیں ملا۔ دروازے پر مبارز ٹھٹھک گیا!۔

"آپ کو میں کس سے ملاؤں۔ جرار بھائی۔ یہاں تو میرا کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ یہ سب کہاں گئے جرار!" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اگر میری امی آج ہوتیں تو وہ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی اپنے سینے سے لگا لیتیں۔ آہ جرار بھائی!... مجھے آنا تھا تو کاش میں پہلے ہی آ جاتا!"

دفعتاً ہال کے باہر ایک سے زائد لوگوں کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں دوسرے لمحے مبارز کو اپنے باپ اور شبانہ کی دھندلی سی شبیہیں دکھائی

"کیا مطلب؟" سردار صاحب زیادہ حیران دکھائی دیے۔ "کون مرحومہ؟
میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا۔"

جبار نے اپنا نفس مطلب واضح کیا۔ سردار صاحب کے تحیر کا کیا ٹھکانہ تھا!
ایک ایک کی صورتیں دیکھ کر بولے۔

"عجیب بات سن رہا ہوں۔ کس بدبخت نے اس کی ماں کو جیتے جی مار
ڈالا ہے۔ بیٹا وہ تو تمہارے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہیں۔ بیمار بہت رہیں۔
چل پھر نہیں سکتیں۔ ورنہ سب سے پہلے تم سے ملنے وہی آتیں!"

مبارز بجلی کی طرح تڑپ کر اندر بھاگا!۔

ثریا بیگم اس کی آمد کی منتظر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ان کی
دھندلی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی! سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا!۔

مبارز کو دیکھتے ہی ایک دلدوز بے تاب چیخ ان کے لبوں سے نکلی اور انہوں
نے بازو پھیلا دیے۔ مبارز ان کی بانہوں میں سما گیا۔

"میرے بیٹے۔ میرے بیٹے!" وہ آنسوؤں سے اس کا چہرہ دھلا رہی تھیں
اس کا منہ چوم رہی تھیں۔ خدا نے رحم کیا مجھ پر۔ مجھے تیری شکل نظر آئی۔
اب نہ جانا۔ [illegible] اب مجھے نہ چھوڑ دینا۔

کمرے میں سب لوگ آ گئے تھے۔ ان کے لئے ماں بیٹے کا یہ ملاپ رقت
آمیز تھا۔ ثریا بیگم نے دفعتہً سردار صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اب نہ کہیے گا اسے کچھ بھی۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔ جس طرح اس کا جینے
کا جی چاہے۔ اسے اسی طرح جینے دیجئے۔ حشر میں آپ کا دامن پکڑ لوں گی اگر آپ
نے اس کا دل دکھایا۔"

"نہیں بیگم۔ کچھ نہ کہوں گا۔ تم دل کو قابو میں کرو۔" سردار صاحب نے کہا۔

تو بے پناہ درد اس کے دل میں اٹھنے لگتا! کس خطا کی سزا اس ناکردہ گناہ
نے بھگتی تھی؟۔

رخشندہ اپنی ساتھی کی موت کے بعد فوراً کیسے ہی ان کے ساتھ واپس
چلی گئی تھی! مگر اسے ہر دم یہی کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کہیں اس کی ذات سے رنجیدہ کوئی
موضوع نہ بن جائے۔ اور اب۔ اس کا یہاں کام کیا تھا؟!

ایک دوپہر جب مبارز اپنے کسی واقف کار سے ملنے چلے گئے تب مبارز
شبانہ کے کمرے میں آ کر تھکا ہارا سا لیٹ گیا۔ وہ اپنا پچھلا عکس رہ گیا تھا
خاموش دل گرفتہ اور پشیمان سا۔ جیسے کسی سے نگاہیں ملاتے ہوئے
بھی جھجکے!۔

شبانہ اس کے لیے کافی لائی۔ چپکے سے بولی۔

"لیجیے!"

اور میز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی!۔ مبارز نے ایک طویل نظر اس پر
ڈالی اور گہری آہ بھر کر رہ گیا!۔ اس کی آہ شبانہ کے دل میں برچھی کی انی کی
طرح تیر گئی!۔ وہ تو جانتی تھی کہ وہ مبارز کی پسند نہیں ہے۔

"کیا خدا مجھے کبھی معاف بھی کرے گا شبانہ؟" اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔
"میں نے اپنی چاہنے والی ماں اور مظلوم بیوی کے آنسوؤں کا سبب بن کے
جو گناہ کیے ہیں ان کا تو کوئی کفارہ نہیں۔"

"امی نے آپ کو معاف کر دیا۔ اور میں۔ میں تو آپ کی کنیز ہوں!"
وہ بڑی مشکل سے بولی اور فرش کو تکنے لگی!۔ "اس حال میں بیٹھو!"

مبارز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اسے بے اختیار اپنے
سے لگا لیا۔

شبانہ کے ایک عزیز شکیل سے طے ہو گئی ہے!۔

شکیل کو مبارز جانتا تھا!۔ اب سوائے اس کے کہ وہ اس خبر پر خوشی کا اظہار کرتا۔ اس کے اختیار میں کیا رہ گیا تھا؟۔

جو چراغ شبانہ کے دل میں روشن تھا!۔ اس نے اس کی روشنی رخشندہ کی زندگی کی طرف پھیر دی۔ رخشندہ نے سوچا... زندگی بلا سے۔ ناکام نصیبی کی نذر ہو کر رہ جائے!۔ اس کی محبت کی آبرو تو رہ گئی!!۔

کبیر صاحب کے خط پر خط آ رہے تھے!۔ جرار بھی زیادہ نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ مبارز کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ چلے جائیں۔ لیکن ان کا قیام ناممکن تھا!۔ سردار صاحب کی مرضی تھی کہ وہ رخشندہ کے نکاح تک مزید رک جاتے!۔ وہ ان کے بے حد شکر گزار تھے جنھوں نے ان کی امانت کی حفاظت کی اور خود ہی الفت پیدا کر دی تھی!۔ ان کی تو ایسی قلب وابستہ ہوئی تھی کہ تعجب ہوتا ثریا بیگم ان کی زندگی کی ساتھی تھیں۔ ان کی بے ہنگام وفات کا صدمہ کیسے نہ ہوتا بیچارے اپنی ساری دنیاوی مصروفیات ترک کر کے بس روزہ نماز ہی کے ہو کر رہ گئے تھے!۔

جوں جوں حیدرآباد جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ مبارز کا دل بیٹھتا جا رہا تھا!۔ اس کا اضطراب دیکھ کر سردار صاحب نے کہا "جرار میاں۔ اپنے والد کی بجائے تم یہ کیوں نہ کرو کہ اپنی بیوی بہن اور باپ کو تھوڑے دنوں کے لئے یہیں چھوڑ جاؤ۔ بیٹے اب تم جاؤ گے تو شاید ہی کبھی آؤ۔ تم سے اور تمہارے والد سے مجھے محبت سی معلوم ہوتی ہے... کیا حرج ہے ان سے بھی ملاقات ہو جائے۔ تمہارے والد سے۔"

"ہو تو سکتا ہے۔ جناب والا۔ مگر ابا جان کے لئے شاید سفر گراں گزرے"

کون جینا پسند کرتا ہے؟۔ بتاؤ۔ رخشندہ!۔ کیا میں تمہاری نظروں سے گر گیا؟۔"

"آپ خوامخواہ اپنا دل دکھا رہے ہیں؟" رخشندہ نے اسے سمجھایا: "میں نے کب کہا کہ مجھے آپ کی وفاؤں پر بھروسہ نہیں تھا۔ کب آپ نے محسوس کیا کہ میں نے آپ کو نظروں سے گرا دیا ہے۔؟ کیا یہ میری زندگی جیت نہ تھی۔ تو پھر رخشی۔ ۔ اندازہ کرو کہ ۔۔۔!"

جب شبانہ ہنستے ہنستے قصہ غم کہہ گئیں!" رخشندہ نے کہا: "تو میں نے سوچا۔ جو حال آپ کی جدائی میں میرا ہے۔ وہی ان کا بھی ہے۔ بلکہ وہ تو آپ کی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔ ان کی حالت مجھ سے بڑھ کر دلِ زار تھی!۔ آپ جیسے بے درد اور سنگدل انھیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چل دیے ان آنسوؤں کا شمار آپ نے کہاں کیا جو ان کی آنکھوں سے بہے تھے۔ وہ درد کب آپ نے محسوس کیں جو جلے دل کا دھواں بن کر ان کے سینے میں ۔۔ آپ ایسے دل باختہ تھے۔ آپ نے ان سے یہ تک کہہ دیا کہ وہ آپ کی پسندیدہ دلہن نہیں ہیں اور آپ نے اپنے دل میں کسی اور کو بسا رکھا ہے ... بے چاری میری شبی ... کتنی اعلیٰ خیال۔ بلند مرتبہ اور عالی حوصلہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آپ کی محبوب کے حق میں دستبردار ہو جاتی!۔ اگر آپ نے میرا نام اس کے سامنے لے لیا ہوتا تو شاید میں ندامت اور احساس جرم کے مارے مجھے پناہ صرف زمین کی آغوش میں ملتی۔"

"میری محبت تمہارے لئے اس قدر باعث ننگ و شرم تھی؟"۔ ۔ ۔ نے ہولے سے پوچھا۔

"باعث فخر تھی اگر آپ تنہا ہوتے!" رخشندہ نے کہا اور پھر بولی۔۔

آپ کسی کی زندگی کا آسرا ہیں۔ اسے ہمیشہ یاد رکھئیے! اگر آپ نے اپنی دلچسپی اور التفات کا کبھی کسی کے سامنے چرچا کیا۔ یا شبانہ ہی کے سامنے کہہ دیا تو یقین کیجئے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی ... دل میں کسی کی محبت کو چھپائے جینا اور مر جانا کتنا نفرت انگیز تصور ہے۔ بس مجھے اسی تصور کے سہارے زندگی بسر کرنے دیجئے۔ آپ کو میری قسم!"

اتنے میں ادھر جرار اور شبانہ آتے ہوئے دکھائی دیئے! جرار کو مبارز کی پہلی محبت کا راز معلوم تھا۔ وہ بے حد شرمسار ہو گیا۔ مگر رخشندہ نے جھٹ سے کہا۔

"بھابی آپ کہاں سرک گئیں تھیں۔ آپ کے صاحب بہادر میری جان کھا رہے تھے۔ زبردستی مجھ سے دعوت لینا چاہتے ہیں۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے!"

بھابی؟ . . مبارز کا دماغ سنّا گیا۔ رخشندہ نے تو کچھ کہنے سننے کو نہیں چھوڑا وہ بناوٹی انداز میں ہنسنے لگا!

"انصاف تو شکیل صاحب کریں گے۔ کیا کسی سے دعوت لینا بھی کوئی جرم ہے!"

شکیل کے نام پر ایک طرف اگر رخشندہ شرمائی تو دوسری طرف شبانہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اسے یاد تھا! کتنی محنت مشقت اور مصیبت اٹھائی تھی اس نے صرف اس کی خوشیاں واپس دلانے کی خاطر۔ وہ اس کی زندگی ویران کر کے دوسری ہستی سے وابستہ ہو گئی۔ شکیل اگر چاہتا تو اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھاتا۔ توصیف صاحب

پیچھے کا سفر نگاہوں سے اوجھل تھا۔

زینت نشاط اور کبیر صاحب آ پہنچے تھے۔ دن بڑے خوبصورت اور نشاط پرور بڑے اچھے گزرنے لگے۔ کبیر صاحب اور سردار صاحب یوں ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے بھائی ملتے ہیں۔ کبیر صاحب نے ایک مرتبہ مبارز سے کہا۔

"مبارز تم نے اپنے والد کے جبر و استبداد کی کہانیاں سنائی تھیں۔ لیکن میں نے تو ان سا نرم دل اور نیک سرشت آدمی نہیں دیکھا۔ غالباً تمہارے ہی اندازے اور فہم کی غلطی ہوگی۔"

مبارز نے ان کے خیالات کی تردید نہیں کی۔ "جی ہاں۔ ابا جان.. آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میرے ہی ان کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔"

سردار منزل میں بہت چہل پہل رہا کرتی۔ لڑکے اور لڑکیوں کی ٹولیاں بنتیں۔ مختلف تفریحات میں وقت گزرتا۔ شبانہ کی بے شمار سہیلیاں تھیں۔ مبارز کے ساتھی تھے۔ غرضیکہ دن بہ دن گزرتے چلے جا رہے تھے مبارز کو اپنی ماں کی موت کا غم ابھی تک ستا رہا تھا۔ مگر سردار اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے۔ اور حتی الامکان کوشش کرتے کہ وہ المناک یادوں سے دور ہی رہے۔

شکیل اور رخشندہ کی شادی کے روز سردار صاحب نے اپنی جائداد کا بٹوارہ کر دیا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ انھوں نے مبارز اور رخشندہ کی مکمل گفتگو شروع سے آخر تک سنی تھی۔ رخشندہ کی قدر و محبت ان کے دل میں اسی وقت پیدا ہوئی جب کہ وہ ان کی بہو نہ بن سکی تھی۔ تدارک اور تلافی کے طور پر انھوں نے اپنی جائداد کے برابر برابر تین حصے کیے تھے۔

اب کاروبار میں مطلقاً جی نہیں لگتا،' سردار صاحب بولے'۔ تین حصے کر دیے ہیں۔ تینوں بچے اپنی اپنی جگہ اپنے کاروبار کو فروغ دیتے رہیں گے! میں تو اپنا آبائی مکان بھی چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن جرار کے یہاں رہوں گا کبھی مبارز کے یہاں۔ بہت سی زندگی کٹ چکی ہے۔ رہی سہی بھی کٹ جائے گی باقی رہے نام اللہ کا۔"

ان کا اصرار کچھ اس قدر اہم اور مستحکم تھا کہ پھر جرار سے بھی انکار نہ ہو سکا البتہ وہ خود کو عجیب سا محسوس کرنے لگے۔ جیسے خلوص اور خدمت کا معاوضہ دیا گیا تھا!۔

کبیر صاحب کو زینت کی فکر تھی!۔ شکیل کی شادی نے گویا سمند ناز پر تازیانہ لگا دیا۔ انھوں نے برسبیل تذکرہ سردار صاحب سے اپنی فکر کا اظہار کیا۔ زینت ہر طرح پسندیدہ اور معقول لڑکی تھی۔ سردار صاحب نے اس کے سلسلے میں حفیظ کو منتخب کیا تھا!۔ توصیف الرحمن صاحب کو کیا اعتراض ہوتا جرار کے تو وہ بڑے مداح اور معترف تھے!۔ زینت ان کی بہن تھی! کبیر صاحب اپنے ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو گئے!۔ زینت جب مبارز کے سامنے آئی تو اسے ہنستے ہوئے دیکھ کر اپنی عادت کے مطابق فوراً ہی چراغ پا ہو گئی

"آپ تو بناتے رہتے تھے ۔۔ یہ چھوٹی بات تھوڑی ہے۔ آپ کا تو بس یہی جی چاہتا تھا کہ خوبصورت لڑکیاں آپ کے آگے پیچھے پھرتی رہیں اور آپ کی محبت کا دم بھرتی رہیں۔"

ادھو۔' مبارز کو بے اختیار ہنسی آئی۔ یہ محترمہ زینت! آپ کو یہ خوش فہمی کب سے ہو گئی کہ آپ خوبصورت بھی ہیں!۔ اگر آپ آئینہ دیکھئے تو پتہ چلے کہ ۔۔۔ کی ۔۔۔ آنکھ چھوٹی ہے دوسری بڑی۔ اور ناک بے چاری

تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کا تذکرہ بے کار ہے!"

"اچھا جی۔ اور آپ کی ناک۔!" زینت جھنجھلا کر بولی۔

"وہ البتہ بے شک خوبصورت کہی جا سکتی ہے!" مبارز نے کہا۔ مگر زینت کے دماغ میں سا پھر لہرا اٹھی بے حد سنجیدہ ہو کر بولی "سنیئے! ریحان صاحب... میں بڑی بے وقوف ہوں!"

"لاریب فیہ... اس میں کچھ کلام نہیں۔ جزاک اللہ۔"

"اگر آپ مجھے بتا دیتے کہ آپ کی جائداد موجود ہیں تو میں تنخواہ جمع نہ کرتی۔ کیا سوچتے ہو گے آپ اپنے دل میں؟!"

"میری بیوی ہیں... آپ کی جان!" مبارز نے پھر چھیڑ دیا۔

"سچ سچ۔ آپ نے مجھے... ایک دن... خود سے اٹھا کر۔ پلنگ پر لٹایا تھا!"

"سچ مچ" مبارز اس کے جذباتی پاگل پن پر مسکرانے لگا!۔ "آپ ننھی منی سی تو ہیں آپ۔ پھول کی طرح اٹھایا اور پلنگ پر ڈال دیا۔ ذرا سی بھی محنت نہیں لگی۔"

"آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں بڑی بے وقوف اور پاگل ہوں" زینت کی آنکھیں چھلکنے لگیں!۔

"میں نے بارہا سوچا تھا زینت!" مبارز نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں اور جرار بھائی کو سب کچھ بتا دوں گا۔ لیکن میرا ارادہ بدلتا گیا۔ اندیشہ ستانے لگا کہ معلوم نہیں۔ جرار بھائی کیا خیال قائم کریں۔ تمہیں وہ غلط فہمی کبھی نہ ہوتی۔ جو آج خلش بن کر تمہارا سکون درہم برہم کر رہی ہے۔ زینت۔۔ یہ ہمارے تمہارے رشتے چاہ کے ہیں!۔ یہ کبھی ٹوٹ سکتے نہیں۔۔۔

پیار کے۔ چاہے ہم انہیں توڑنا بھی چاہیں!۔ پیاری بہن! دکھ کے آنسوؤں کو سکھ کے آنسوؤں سے بدل دو۔ کہ انسان خود کو بہلائے بغیر جی نہیں سکتا!۔"

کبیر صاحب، جرار اور نشاط کو چھوڑنے کے لئے تقریباً وہ سب اسٹیشن پر موجود تھے۔ ہار پھول لئے ہوئے۔ بادل ناخواستہ آپس میں جدا ہو رہے تھے۔ مبارز سے پلٹ کر سچ مچ بچوں کی طرح رونے لگا تھا!۔

سردار صاحب بھی متاثر تھے!۔

اب کہاں وہ رونقیں۔ وہ چہل پہل۔ وہ شادمانیاں۔ ہر ایک جدا ہونے کے لئے ہنگامی طور پر تلا تھا!۔

حنا۔ جرار کے جانے سے پہلے ان سے الگ ایک طرف ملی اور بہت رازداری کی قسمیں لینے کے بعد بولی۔

جرار صاحب... ایک کانٹا میرے دل میں کھٹک رہا ہے اگر میں نے آپ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف نہ کیا تو شاید اس کی کھٹک مجھے بڑی مدت تک بے چین کئے رہے گی!۔"

بلا تکلف کہئے،" جرار نے کہا۔" میں آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

جرار صاحب!..." حنا نے کہا۔" پروفیسر مبارز کے نام ان کے باپ کے انتقال کی فرضی خبر رشید کے نام سے میں نے بھیجی تھی..."

پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔" ان پر مجھے مبارز کا شک ہوا تھا مجھے شک کو میں یقین کا درجہ اسی سنسنی خیز طریقے سے دے سکتی تھی

کیونکہ مجھے معلوم تھا۔ انیس اپنی ماں سے بدرجہا محبت تھی اور وہ ان کی وفات کی اطلاع پاکر خود کو ریحان کے فرضی نقاب کے پیچھے عرصہ تک پوشیدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ میرا خیال اور گمان تو ٹھیک نکلا!۔ مگر۔ مجھے بے حد صدمہ ہے کہ میری پیشن گوئی کیوں صحیح نکلی؟!۔

دور سے ٹرین نے وسل دی۔ سگنل گر گیا۔ اور پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی!۔

جرار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپ کی نیت بری نہیں تھی!۔ قضا و قدر کے ہاتھوں میں انسان کھلونا ہے... یہ خلش اپنے دل سے دور کیجئے۔

اچھا بہن۔ خدا حافظ۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا!۔"

(ختم شد)

عفت موہانی

کے وہ ناول جنھوں نے اردو ناول نگاری میں ایک نئے سنگ میل کا اضافہ کر دیا ہے۔

پندار	ستم کے سہارے	ہمسفر	شام تمنا	مداوا
زیر طبع	6/50	زیر طبع	زیر طبع	8/-

آخری تحفہ	محبت نام ہے غم کا	قافلے بہار کے	غمگسار
8/-	7/-	6/50	6/50

صنم	داغ دل	بزدل	محبت کی راہیں	درد و درماں
10/-	6/50	7/-	6/50	7/-

راز	آہوں کے گیت	شہر آرزو	سویرے
7/-	9/-	6/50	7/75

سزا	پیماں
8/-	12/-

ملنے کا پتہ

نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ

نسیم انہونوی

کے اصلاحی اور سبق آموز ناول جنھیں ہر گھر میں بلا تکلف پڑھا جا سکتا ہے۔

آفاق	ارمان	بانو	پرایا دھن	تمنا
4/-	زیر طبع	9/-	11/-	8/-
حسینہ	**خاتون**	**رحمت**	**شبنم**	**سراب زندگی**
5/-	زیر طبع	5/-	3/50	5/50
شبانہ	**شگفتہ**	**مہتاب**	**مہ پارہ**	**کہکشاں**
8/-	6/-	7/-	7/-	زیر طبع
نجم السحر	**مس طلعت**	**نشاط**	**طرز زندگی**	
زیر طبع	7/-	زیر طبع	4/-	

شوہر کا رنگ 3/- ۔ حسرت 4/-

ملنے کا پتہ

نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ